ولی گجراتی

مرتبہ

ڈاکٹر سید ظہیر اللہ بن مدنی ایم۔ اے، پی۔ ایچ۔ ڈی

ادبی پبلشرز بمبئی

سلسلۂ مطبوعات انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ بمبئی

ولی گجراتی

مرتبہ

ڈاکٹر سید ظہیر الدین مدنی ایم۔ اے، پی۔ ایچ۔ ڈی

ڈائرکٹر انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ بمبئی

ادبی پبلشرز بمبئی

ناشر: ادبی پبلشرز۔ ۸ شیفرڈ روڈ۔ بمبئی ۸

مطبوعہ: یونیورسل فائین آرٹ لیتھو پریس۔ بمبئی ۲

کاتب: ظہیر احمد

قیمت: دس روپے

سال طباعت: مارچ سنہ ۱۹۷۴ء

فہرست

دیباچہ طبع دوم		
دیباچہ طبع اوّل		
ولی کا زمانہ	۱۶	۶۸
سوانح حیات	۶۹	۱۰۲
ولی کی علمی استعداد	۱۰۳	۱۱۰
نور المعرفت	۱۱۱	۱۲۲
ولی کے مرغوب فارسی شعراء	۱۲۳	۱۴۵
ولی کے کلام میں ہندوستانی عنصر	۱۴۶	۱۶۴
ولی کی زبان	۱۶۵	۱۹۳
ولی کا فن و اجتہاد	۱۹۴	۲۲۶
ولی کی صوفیانہ شاعری	۲۲۷	۲۴۲
کتابیات	۲۴۳	۲۴۴

طبع دوم

ولی گجراتی کا پہلا اڈیشن سنہ ۱۹۵۰ء میں شائع کیا گیا تھا۔ دوسرا اڈیشن بہت صبر آزما تاخیر سے شائع کیا جارہا ہے۔ پہلے اڈیشن کے بعض مضامین میں حسب ضرورت ترمیم و تنسیخ کی گئی ہے اور چند مضامین کا اضافہ کرکے اس اڈیشن کو بہتر بنانے کی کوشش کی گئی ہے ولی کی زبان سے متعلق ایک مفصل مضمون شامل کیا گیا ہے۔ رسالہ نور المعرفت کے متن کو بھی اس دفعہ شامل کرلیا گیا ہے تاکہ اس کے مطالعہ سے ولی کی علمی لیاقت، فارسی دانی اور فنی صلاحیتوں کا بخوبی اندازہ ہوسکے۔ رسالہ کے ساتھ اس کے کلام کا تقابلی مطالعہ سود مند ثابت ہوگا۔ اس اڈیشن میں 'ولی کا فن' اور 'ولی کی صوفیانہ شاعری' کے عنوان سے دو اور مضامین کا اضافہ کیا گیا ہے۔ رسالہ اردو بابت جولائی سنہ ۱۹۵۶ء میں ولی کی شاعری کے عنوان سے ایک مضمون شائع کیا گیا تھا۔ ولی کی صوفیانہ شاعری مذکورہ مضمون کا آخری حصہ ہے اور بقیہ ولی کا فن واجتہاد میں کام میں لیا گیا ہے۔ اس اڈیشن میں ایک اہم اضافہ بابائے اردو اور احمد میاں اختر جوناگڈھی کے بیانات ہیں ان سے شمس ولی اللہ اورنگ آبادی کی شخصیت کا پتہ چلتا ہے جو بزرگ ولی لحراتی سے مختلف ہیں۔

مجھے افسوس ہے کہ اس اڈیشن میں ولی سے قبل اور ولی سے بعد کے استادان فن کے کلام سے ولی کے کلام کا تقابلی مطالعے پر مضمون شائع نہ ہوسکا۔ مجھے امید ہے کہ ولی دوست ولی کی تخلیقات کا مختلف زاویوں سے مطالعہ کرکے اس اہم غزل کی عظمت و بلندی کو اور زیادہ واضح کرنے کی کوشش کریں گے۔

دیباچہ

(طبع اوّل)

اُردو زبان کے سب سے پہلے بڑے شاعر ولی کی شخصیت کے بعض پہلو ایسے ہیں جن پر محققین مختلف رائیں رکھتے ہیں لیکن یہ اختلافات ولی کے حق میں مفید ثابت ہوئے اور انہی اختلافات نے اہل علم کو اس بات پر آمادہ کیا کہ اس کی زندگی سے متعلق ہر قسم کے واقعات جاننے اور اس کے گوناگوں کمالات کی تلاش و جستجو میں حتی الامکان کوشش کریں چنانچہ ولی کے نام اس کے سن ولادت و وفات ، وطنیت ، مذہب و ملت ، علمی قابلیت ، اس کے رنگ تغزل اور شاعرانہ فن کاری پر کئی اہل علم نے اپنی تحقیق و کاوش کے نتائج سے اردو ادب میں ایک گراں قدر اضافہ کیا ہے۔

بزم ولی کے شرکت کرنے والوں میں ڈاکٹر عبدالحق صاحب پیش پیش ہیں جنھوں نے ولی کا سنہ وفات تحقیق کر کے کئی غلط فہمیوں کا خاتمہ کر دیا۔ مولوی صاحب نے انجمن ترقی اُردو کی طرف سے کلیات ولی مرتبہ مولانا احسن مارہروی مرحوم شائع کر کے ولی سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے ضیافت طبع کا سامان بہم پہونچا دیا۔ احسن مرحوم نے بھی کلیات کے مرتب کرنے میں بڑی محنت و کاوش سے کام لیا اور ایک مقدمہ بھی لکھا جو کئی حیثیتوں سے بہت مفید ہے اس

یں ولی کے مختلف پہلوؤں پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔ ولی کے وطن پر بھی مفصل بحث کی گئی اور لسانی پہلو کے پیش نظر ولی کو دکھنی قرار دیا گیا۔ یہ دیکھتے ہوئے کہ کلیات ولی کا پہلا اڈیشن نایاب ہے مولوی عبدالحق صاحب نے اسے دوبارہ شائع کیا۔ طبع دوم کے لائق مرتب جناب نورالحسن صاحب ہاشمی نے بہت ہی جامع طریقہ پر ولی کے رنگ تغزل اور شاعرانہ کمال پر اظہار خیال کیا ہے۔ اس میں ڈاکٹر عبدالستار صاحب صدیقی کا، ولی کی زبان پر عالمانہ تبصرہ بھی شامل ہے جس میں دہلوی زبان کا دکن پر اثر دکھایا ہے اور ولی کی زبان اور دہلوی زبان میں مشابہت و مماثلت کو واضح کیا ہے ڈاکٹر عبدالحق صاحب پہلے محقق ہیں جنھوں نے بمبئی اور احمدآباد کے کتب خانوں کی مدد سے ولی کا صحیح سنہ وفات دریافت کیا ہے۔ ولی کے سلسلہ میں اہل دکن کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ انھوں نے ولی کو روشناس کرانے اور اس سے متعلق قریب قریب تمام پہلوؤں پر معلومات بہم پہنچا کر ولی سے اپنی عقیدت مندی کا ثبوت دیا ہے۔ اُن اہل علم میں سے جناب ڈاکٹر سید محی الدین قادری کا نام سرفہرست ہے موصوف ہی کی کوششوں کا یہ نتیجہ تھا کہ ۱۹۳۷ء میں اہل دکن نے بڑے تزک و احتشام کے ساتھ ولی کی دو صد سالہ برسی منائی اور ولی کی شاعری پر مقالے لکھوا کر شائع کیے گئے اس جشن کی یادگار الموسی کا ولی نمبر ہے۔ اس سلسلہ میں دکن کا دوسرا قابل قدر کارنامہ ادارۂ ادبیات کے سلسلۂ مطبوعات کی ایک کڑی "نذر ولی" ہے۔ یہ جامعہ عثمانیہ کی جماعت ایم اے کی چار طالبات کے مقالات کا مجموعہ ہے۔ ان مقالات میں ولی کے تخیل، اس کے فن شاعری، اس کی معلومات اور متصوفانہ کلام پر شرح و بسط سے بحث کی گئی ہے۔ گجرات میں تقدم کا سہرا غلام محمد منظور شاگرد میاں سمجھو کے سر ہے

جنھوں نے ۱۹۲۸ء میں ولی کا دیوان مرتب کرکے مقدمہ کے ساتھ شائع کیا۔[1] اس سلسلہ میں جناب پروفیسر حیدر ابراہیم صاحب سایانی نے بھی ۱۹۲۱ء میں ولی کا دیوان دہلی سے شائع کیا۔[2] موجودہ مصنّفین میں مکرم دوست جناب حسینی پیر صاحب نے رسالہ شہاب میں ولی کے خاندان اور وطن پر اپنی معلومات پیش کرکے تلاش و جستجو کے لئے کافی مواد بہم پہونچایا۔ دوسرے بزرگ جناب قاضی احمد میاں صاحب اختر جوناگڈھی ہیں جنھوں نے ولی کی وطنیت پر محققانہ مقالہ مصنف علی گڑھ[3] میں شائع کرکے ایک طرف اپنے علم و فضل اور تلاش و تحقیق سے اہل ذوق کو مستفید ہونے کا موقع دیا اور دوسری طرف وطنیت کی بحث میں اہل گجرات کی نمائندگی کا حق ادا کیا۔ یہاں جناب یحییٰ تنہا صاحب غازی آبادی کو فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ موصوف نے ولی کے سنہ وفات[4] پر کافی بحث کی ہے اور اپنے بیان کی تصدیق میں بڑی عرق ریزی سے کام لیا ہے۔

چوں کہ آج تک ولی کے خاندانی حالات پردۂ اخفا میں تھے اور اس لئے غزل کے اس بابا آدم کے اجتہاد اور دوسرے پہلوؤں کے متعلق محققین سخت مغالطہ میں مبتلا رہے اور انہوں نے اس کی وطنیت کا قصر عالی زبان کی بنیاد پر تعمیر کیا۔ بعض اہل قلم نے لسانی پہلو کے پیش نظر ولی کو دکھنی اور رنگ آبادی خیال کیا اور اس کے مرتبۂ زبان و کلام کو سفر دہلی اور شاہ گلشن سے ملاقات کا فیض سمجھا اگر ولی کی زبان کو بنظر تعمق دیکھا جائے تو بالکل واضح ہو جاتا ہے کہ یہ کسی ایک علاقہ سے تعلق نہیں رکھتی بلکہ گجرات، دکن اور شمالی ہند سب اس کی قلمرو میں شامل ہیں اور یہی لسانی وحدت ولی کی جدت بیان کا کرشمہ ہے لیکن گجرات کے بعض اہل علم کے طفیل اب ہمیں

---

[1] مطبع حیدری بمبئی ۲ھ ۱۳۴۷ھ ۳ھ بابت اکتوبر ۱۹۲۵ء ۴ھ رسالہ "زمانہ" اپریل ۱۹۲۴ء

ولی کے خاندان، حسب نسب، دوست احباب، عزیز و اقربا سے پوری واقفیت ہو چکی ہے اور ان امور کے ذریعہ اس کے گجراتی و دکھنی ہونے کا پیچیدہ مسئلہ بہت آسانی سے سمجھ میں آجاتا ہے۔

بعض محققین نے ولی کو نرا شاعر ہی سمجھا اور اسی لئے اس کی استعداد علمی کے بارے میں کوئی حتمی رائے پیش نہ کر سکے۔ اگر ولی کے کلام کا بامعان نظر مطالعہ کیا جائے تو اس کی علمی قابلیت کا صحیح اندازہ ہو سکتا ہے بعض اہل علم ولی کی علمی استعداد کے شاکی تھے مگر خدا کا شکر ہے کہ نور المعرفت کی اشاعت کے بعد اب اس قسم کے شک و شبہ کے لئے کوئی گنجائش باقی نہیں رہی اور بلا تامل کہا جا سکتا ہے کہ ولی صرف شاعر ہی نہ تھا بلکہ ایک جید عالم اور انشا پرداز بھی تھا۔ کتب متداولہ پر اسے پورا عبور حاصل تھا اور علوم عقلی و نقلی سے وہ پوری طرح واقف تھا۔ ولی قرآن و تفسیر، تصوف و فلسفہ، معانی و بیان کی اصطلاحوں کو جس طریقہ پر اپنے کلام میں لاتا ہے اور انھیں اصطلاحوں کو رسالہ نور المعرفت میں نثر و انشا پردازی کے خیال سے استعمال کرتا ہے اس سے صاف ظاہر ہے کہ ولی غیر معمولی صلاحیتوں کا مالک تھا۔

ولی اپنے زمانہ میں ایک مصلح زبان کی حیثیت سے آیا تھا نہ صرف شاعر ہونے کے علاوہ ادب کا نبض شناس بھی تھا۔ اس نے اپنے زمانہ کی زبان میں ایک انقلاب پیدا کر دیا۔ فارسی اور ہندی کے امتزاج سے ریختہ کے مناسب ایک زبان کو رواج دیا اگرچہ ولی سے قبل بھی فارسی ادب سے کام لیا گیا تھا مگر وہ ناکافی تھا۔ دکن نے فارسی کے سرمایہ شعر و سخن سے جو فائدہ اٹھایا۔ اس میں ایک خاص توازن پایا جاتا ہے

ولی نے سب سے بڑا کام یہ کیا کہ فارسی کے بے شمار محاورے اردو میں ترجمہ کر کے کچھ اس طرح کھپا دیئے کہ یہ اُردو کے اپنے ہو گئے اس اقدام سے اردو زبان کو یہ فائدہ پہنچا کہ اس کے الفاظ کے خزانہ میں ایک بیش بہا اضافہ ہو گیا غرض ولی نے زبان میں تازگی و توانائی پیدا کرنے کے لئے اسے بہترین آلہ بنایا۔

ولی نے ہندوستانی عنصر کو بھی ہاتھ سے جانے نہ دیا اس کے کلام کو بغور دیکھیے ہیں تو صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس کی کرشمہ آفرین طبیعت نے ایک بڑا خوبصورت امتزاج پیدا کر دیا ہے۔ کلام میں جہاں ایرانی تیر و نشتر پائے جاتے ہیں وہاں ارجن کے بان بھی چل رہے ہیں دجلہ و فرات کے مقابلہ میں نربدا اور تاپتی کو بھی بہایا ہے بلبل ہزار داستان کی نغمہ سنجیوں کے سامنے کوئل کی کوک بھی سنائی دیتی ہے رام اور لچھمن، کاشی اور ہردوار وید اور برہمن اس کے کلام کی صنعت گری کو زینت بخشتے ہیں غرض اس کا کلام فارسی کی وجہ سے شام اودھ ہے تو ہندوستانی عنصر کی وجہ سے صبح بنارس ہے۔ اگر کچھ مدت اور ریختہ کی پرورش و پرداخت جنوبی ہند تک محدود رہتی تو ممکن تھا کہ ہندوستانی عنصر کا رنگ اردو نظم پر بہت گہرا چڑھ جاتا اور شمالی ہند میں پہنچنے کے بعد یہ عنصر فارسی کے ساتھ برابر کا شریک ہوتا۔

اگرچہ شاہان دکن کے کُلّیات اس حقیقت کے مظہر ہیں کہ ولی سے پہلے بھی صنف غزل میں کافی داد سخن دی گئی مگر اس کے باوجود یہ ناقابل انکار حقیقت ہے کہ ولی کے یہاں اردو غزل ایک ایسے بلند مقام پر پہنچی جو فارسی نظم و نثر کے اساتذہ کے لئے بھی قابل رشک ثابت ہوئی۔ ولی سے قبل ریختہ گو کسی قسم کی روحانیت اور تاثیر پیدا نہ کر سکے۔ ان کے مقابلہ میں ولی کے یہاں دوسرا عالم ہے۔ خیالات کی

فراوانی، حسن و عشق کی نیرنگیاں، فلسفۂ حیات کے نکات، تصوف کی آمیزش، اندازِ بیان، پاکیزہ زبان اور فن کارانہ صنعت گری نے مل کر اردو غزل کے قالب میں روح پھونک دی۔ غزل میں ولی کا یہ اجتہاد اس کی امتیازی شان ہے اور غزل گو کی حیثیت سے یہ اس کی شاعرانہ عظمت کا ذمہ دار ہے۔ جب اس خضرِ سخن نے آبِ حیات کو غزل کی صورت میں پیش کیا تو ہر طرف سے اس کی رہنمائی کا غلغلہ اٹھا اور شمالی ہند کے معجز بیان اساتذۂ فن نے اس کی رہنمائی کی محض داد ہی نہ دی بلکہ اس کی تقلید کو اپنے لئے باعثِ فخر بھی سمجھا۔

غزل کے ظاہری و معنوی محاسن کی روشنی میں ولی کے کلام کا مطالعہ کیا جائے تو نقشہائے رنگ رنگ نظر آتے ہیں۔ ولی کو ایک باکمال شاعر بنانے میں اس کے ماحول کا بھی بڑا حصہ ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب ناصر علی سرہندی نے مضمون آفرینی اور استعارات و تشبیہات کی جدت سے دھوم مچا رکھی تھی۔ الفاظ کی تراش خراش اور ترکیبوں کی ندرت بھی اس زمانہ کی ایک خصوصیت تھی۔ ولی کا کلام اس بات کی دلیل ہے کہ یہ ان سے بہت متاثر تھا۔ ولی کا طویل بحروں میں غزلیں کہنا بھی اس اثر کا غماز ہے۔ ولی کے یہاں جانی پہچانی تشبیہوں اور پرانے استعاروں کی کمی نہیں لیکن یہ اس کے شاعرانہ تخیل کی بدولت کہنگی و فرسودگی کے الزام سے بری ہیں۔ اسی طرح ولی کے یہاں صنائع لفظی و معنوی کی کمی نہیں اس کا کلیات ان سے بھرا پڑا ہے لیکن ان کی تکرار سے وہ بدمزگی پیدا ہونے نہیں دیتا۔ ایہام، مراعات النظیر، تضاد، حسن تعلیل، ردالعجز علی الصدر، تجنیس، تنسیق الصفات، تلمیح کی بے شمار مثالیں اس کے اشعار میں ملتی ہیں۔ خصوصاً صنعت ایہام کو بہت ہی سلیقہ مندی

سے کام میں لیا ہے۔

ہمارا ولی ان صوفی شعرا کے گروہ سے تعلق رکھتا ہے جنھیں تصوف وراثتہً اور صحبتہً ملا تھا۔ ولی ایک صوفی خاندان کا چشم و چراغ تھا یہ جب سن شعور کو پہنچا تو اپنے اردگرد صوفیوں ہی کو پایا۔ اس کے کان اہل اللہ کے نعروں سے بچپن ہی سے آشنا ہو چکے تھے ولی کا وہ زمانہ ہے جب احمد آباد میں مشائخ کا سکہ چلتا تھا۔ تمام سلسلوں کے خدا رسیدہ شیوخ موجود تھے علامہ وجیہ الدین قدس سرہٗ کا مدرسہ اور علوم کے دوسرے سرچشمے تشنگان علوم کو سیراب کر رہے تھے۔ ایسے ماحول اور ایسی صحبتوں کی وجہ سے ولی کے خمیر میں جو صلاحیت تھی اسے ترقی پانے کا موقع مل گیا اور مولانا شیخ نورالدین صدیقی سہروردی قدس سرہٗ کی توجہ خاص نے سونے پہ سہاگہ کا کام کیا۔ اتفاق سے ولی نے زمانہ بھی سیاسی شورشوں اور انقلابوں کا پایا۔ گجرات پر مرہٹوں نے پے در پے حملے کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی۔ گجرات کا امن رخصت ہو چکا تھا۔ دکن میں بیجاپور اور گولکنڈہ برسوں کی کش مکش کے بعد اورنگ زیب کے ممالک محروسہ میں شامل ہو چکے تھے ادھر اورنگ زیب کی آنکھیں بند ہوئیں ادھر تخت و تاج کے لئے تلواریں میان سے نکل آئیں دوسری طرف خانہ جنگیوں کو دیکھ کر مرہٹوں نے پھر سر اٹھایا۔ غرض ولی نے یہ سب کچھ آنکھوں سے دیکھا تھا۔ یہ ایک زمانہ ہوتا ہے جب لوگ قہر الٰہی سے مذہب میں پناہ ڈھونڈھتے ہیں اور ایسے وقت میں دانا و بینا مذہب ہی کا پرچار کرتے ہیں ولی کے دل پر بھی دنیا کی بے ثباتی اور جاہ و حشمت کی بے وقعتی نے ضرور اثر کیا ہوگا۔ ولی کو خدا نے شعر گوئی کا فن بھی عطا کیا تھا اس نے اس عطیۂ الٰہی سے پورا فائدہ

اٹھایا اور کہیں کہیں مجاز کے رنگ میں حقیقت کو پیش کیا۔

جب ہم ولی کے کلام کا مطالعہ اس نقطۂ نظر سے کرتے ہیں تو بادی النظر میں معلوم ہوتا ہے کہ ہر ورقے دفتریست معرفت کردگار مگر ایسا کہنا دلی سے انصاف نہ ہوگا۔ ولی کے کلام کا بیشتر حصہ تو یقینی اسی دنیا کے عشق سے تعلق رکھتا ہے۔ کلام کا ایک حصہ صوفیانہ رنگ میں پایا جاتا ہے۔ چوں کہ فلسفہ و اخلاق تصوف سے گہرا تعلق رکھتے ہیں اس لئے اس نوع کے بھی اشعار ملتے ہیں۔ غرض ولی صوفیوں کے ماحول میں پرورش پایا تھا اور خود صوفی منش تھا اس لئے اس نے اس رنگ میں جو کچھ کہا ہے وہ بے جان اور رسمی نہیں ہے۔ اس کے جذبات مستعار نہیں ہوتے ان میں عارفانہ سرمستی اور آزاد منشی جلوہ گر ہے۔

اگرچہ ولی غزل گو شاعر تھا لیکن اس نے تمام مروجہ اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ اس نے کوئی طول طویل مثنوی نہیں کہی اس کے باوجود اس کی مثنویوں میں روانی و سلاست پائی جاتی ہے اور اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اگر مثنوی پر ولی زیادہ توجہ مبذول کرتا تو بہت کامیاب مثنوی گو شاعر ہوتا اور اپنی کہنہ مشقی کا بہترین ثبوت دیتا۔ ولی نے کسی بادشاہ یا امیر کی شان میں قصیدہ مدحیہ نہیں کہا مگر اس صنف میں اس نے اپنی جودت طبع کے لیے حمد و نعت اور پیران طریقت کی ثنا کو اختیار کیا ہے۔ اس کے قصائد سے اس کی قادر الکلامی ظاہر ہوتی ہے اور اگر ولی اس طرف متوجہ ہوتا تو ممکن تھا کہ سودا سے قبل ولی کو قصائد کا بادشاہ سمجھا جاتا۔ اس کے دو تین قصیدے عرفی کے تتبع میں لکھے گئے ہیں اور ایک قصیدہ میں تو وہ عرفی کے ایک مشہور مصرع کی تضمین بھی کرتا ہے کہ ؎

ایں قصیدہ بیاضی بود نہ دیوانی

موجودہ تصنیف میں ہم نے ولی کے بعض خاص پہلوؤں کو موضوع بنایا ہے اب تک ولی کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر اہل قلم نے جو عرق ریزی کی ہے ان میں ولی کے سوانح حیات ولی کی وطنیت، اس کی استعداد علمی و فارسی دانی اور اس کے کلام میں ہندوستانی عنصر اہم موضوع ہیں۔ ان پہلوؤں کا ولی کی شاعری سے بہت گہرا تعلق ہے اور انھیں غیر معمولی لیاقتوں نے ولی کو ایک مجتہد بے مثل شاعر اور امام غزل بنایا۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ اگر ولی ان گوناگوں خوبیوں کا مالک نہ ہوتا تو اس کے کلام کی کیا حیثیت اور کیا وقعت ہوتی۔ لیکن بلا تامل کہا جاسکتا ہے کہ اگر ولی علوم و فنون اور زبان کے نشیب و فراز سے کماحقہٗ واقف نہ ہوتا تو قدرتی شاعر ہونے کی وجہ سے ایک طومار نویس تو ہوتا مگر نہ تو یہ لسانی وحدت قائم کرنے میں کامیابی حاصل کرتا نہ اس کے کلام میں تازگی و جدت لطیف ذوق اور شاعرانہ سلیقہ مندی کا نمونہ ہوتا۔

چوں کہ ولی کی شاعری اور اس کے مختلف پہلوؤں پر بعض اہل قلم نے داد تحقیق دی ہے بسر و دست ان پہلوؤں کو ہم نے اس کتاب میں شامل نہیں کیا ہے۔ انشاءاللہ آئندہ کسی وقت اگر حالات نے مساعدت کی تو بقیہ پہلوؤں پر بھی روشنی ڈالنے کی کوشش کی جائے گی۔

کتاب کے مختلف مضامین میں سے ولی کی علمی استعداد اور فارسی کے مرغوب شعرا، وہ مضامین ہیں جو رسالہ اردو بابت جنوری ۱۹۴۷ء میں شائع ہو چکے ہیں۔

یہاں اُردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے اغراض و مقاصد اور لائحہ عمل کا مختصر طور پر ذکر کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کیونکہ زیر نظر کتاب اسی لائحہ عمل کو عملی جامہ پہنانے کی پہلی کوشش ہے۔

سنہ ۱۹۴۷ء میں اس کے قیام کے بعد سے انسٹی ٹیوٹ اپنی منزل مقصود کی طرف تیزی سے بڑھ رہا ہے۔ اس کے لائحہ عمل کے پیش نظر ایک سہ ماہی رسالہ کا اجراء کیا گیا جسے اہل علم اور ارباب ذوق نے پسندیدگی کی نظر سے دیکھا۔ 'نوائے ادب' کا سب سے اہم مقصد یہ ہے کہ گجرات کے متعلق قدیم اُردو کے کارنامے جو اب تک منظر عام پر نہیں آئے ہیں انھیں مضامین کے ذریعہ روشناس کرایا جائے۔ 'نوائے ادب' میں مثنویوں کا سلسلہ اسی مقصد سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ دیکھ کر مسرت ہوتی ہے کہ گجرات کے قدیم ادب سے دلچسپی رکھنے والے حضرات بھی اس طرف متوجہ ہوئے ہیں اور مثنویوں پر مضامین سپرد قلم کر رہے ہیں۔

انسٹی ٹیوٹ کا سب سے اہم کام تلاش و تحقیق ہے اگرچہ چند اسباب کی وجہ سے اس کی رفتار بہت دھیمی ہے تاہم اسے نظر انداز نہیں کیا گیا۔

سلسلۂ تصنیف و تالیف انسٹی ٹیوٹ کے لائحہ عمل کا ایک اہم جزو ہے حالات ناسازگار ہونے کے باوجود اب یہ طے کیا گیا ہے کہ ہر سال کم از کم ایک کتاب شائع کی جائے۔ موجودہ کتاب "ولی گجراتی" (ولی کی زندگی کے بعض پہلو) اس سلسلہ کی پہلی کڑی ہے۔ اُمید ہے کہ تلاش و تحقیق سے دلچسپی رکھنے والے حضرات اور اہل ذوق ہماری اس کوشش کو بنظر استحسان ملاحظہ فرمائیں گے۔

انسٹی ٹیوٹ اپنی تمام کارگذاری کے لئے جناب سید شہاب الدین صاحب

دستوی جنرل سکریٹری انجمن اسلام بمبئی کا مرہون منت ہے۔ صاحب موصوف نے انسٹی ٹیوٹ کے معاملات میں جس دلچسپی کا اظہار کیا ہے اور کارپردازوں کی جس طرح حوصلہ افزائی فرمائی ہے اس کے لئے ہم ان کے تہہ دل سے شکرگذار ہیں

آخر میں میں پروفیسر سید نجیب اشرف صاحب ندوی اور جناب محمد ابراہیم صاحب ڈار کا بہت شکرگذار ہوں کہ ان دونوں حضرات نے ناچیز کو اپنے علم و فضل سے استفادہ کرنے کا موقع دیا۔ جناب فضل اللہ صاحب فاروقی، ناظم کتب خانہ اور احمد ملک طاسے ایم اے کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انھوں نے کتابت اور طباعت کی منزلوں میں راقم کی کافی مدد کی ہے۔

سید ظہیر الدین مدنی

بمبئی۔ ۱۲ مارچ ۱۹۵۰ء

ولی کا زمانہ

خاکدانِ ہندوستان پر مسلمانوں نے سات سو سال اپنی حکومت کا پرچم لہرایا۔ اس دور میں اکبر جیسے کشورستان اور شاہجہاں جیسے ہردلعزیز بادشاہ گذرے مگر اس دور میں اورنگ زیب کا عہد ہر حیثیت سے اہمیت رکھتا ہے سلطنت تیموریہ اسی دور میں معراج کمال کو پہنچی اور اسی کے بعد سے خاندان مغلیہ کے بدر حکومت میں کاہیدگی شروع ہوگئی۔ سلطنت مغلیہ کا استحکام و عروج، رعب و جلال تمکین و وقار اور عظمت و حشمت اورنگ زیب کے تدبر، سیاست دانی اور انصاف پسندی کا نتیجہ تھا لیکن زوال حکومت کے جراثیم بھی اسی فرمانروا کے عہد حکومت میں پرورش پائے جو اورنگ زیب کے عزم و جزم کے سامنے پوری طرح اپنا زہر پھیلا نہ سکے مگر اس شہنشاہ والاتبار کی آنکھیں بند ہوتے ہی ایسی تحریکیں رونما ہوئیں اور ایسے شگوفے پھوٹے کہ جن پر قابو پانا کسی کے بس کی بات نہ تھی اور حقیقت یہ ہے کہ اورنگ زیب کے بعد خاندان تیموریہ میں کوئی ایسا صاحب عقل و فراست اور صاحب سیف و قلم پیدا بھی نہ ہوا جو اتنی وسیع سلطنت اور مختلف مذاہب و اقوام کے ملک

پر اپنی رائے و تدبیر یا سنان و شمشیر سے اپنا اقتدار قائم رکھ سکتا۔ اس عروج و استحکام کا دوسرا سبب یہ ہے کہ اورنگ زیب وہ خوش قسمت بادشاہ تھا جس نے اتنی طویل عمر پائی کہ وہ اپنے ارادوں کو عملی جامہ پہنانے کی کوششوں میں بڑی حد تک کامیاب ہوا۔

آیئے اس کے پنجاہ سالہ دور پہ ذرا غائر نظر ڈالیں۔

۱۶۵۷ء کی ۶ ستمبر کو شاہجہاں بیمار پڑا۔ علالت کی خبر کا پھیلنا تھا کہ حقدار تیموری شہزادوں نے ریشہ دوانیاں شروع کر دیں۔ دارا شکوہ شاہجہاں کے حضور میں تھا یوں کہ شاہجہاں دارا شکوہ پر اپنی مہربانیوں اور شفقت پدرانہ کی بارش برسا رہا تھا اس لئے اس نے دارا کو اجازت دے رکھی تھی کہ وہ دارالخلافہ میں رہ کر نائبوں کے ذریعے اپنے علاقوں میں حکومت کے کام انجام دے۔ اس کے برعکس شاہ شجاع کو بنگالہ کی صوبہ داری تفویض کی گئی تھی، مراد کو گجرات کا صوبہ دار بنا دیا تھا اور اورنگ زیب کو دکن کے دور دیس میں مصروف کار رکھا۔ شجاع نے باپ کی بیماری کی خبر سنتے ہی اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا اور بشیر فوج کے ساتھ آگرہ کی طرف بڑھنا شروع کیا، شاہجہاں کی طبیعت ایک ہی ہفتہ میں سنبھل گئی اور وہ اطبا کے مشورے سے دہلی کی گرم آب و ہوا میں سے آگرہ چلا آیا تھا۔ اگرچہ شاہجہاں نے آگرہ میں دربار منعقد کیا تاکہ رعایا کو یہ پتہ چل جائے کہ بادشاہ زندہ ہے تمام شہزادوں کو بھی واپس لوٹ جانے کے لئے خطوط لکھے لیکن سب کچھ بے سود ثابت ہوا۔ آخر دارا نے اپنے بیٹے سلیمان شکوہ کو بائیس ہزار کی فوج دے کر شجاع کے مقابلہ میں روانہ کیا۔ اس وقت تک شجاع پٹنہ اور الہ آباد ہوتا ہوا بنارس تک پہنچ چکا تھا۔ بنارس کے قریب بہادر پور ۱۶۵۸ء فروری میں شجاع اور سلیمان شکوہ

صف آرا ہوئے۔ شجاع نے اس جنگ میں زک اٹھائی اور بنگالہ کا رُخ کیا سلیمان شکوہ نے شجاع کا تعاقب کیا۔

دکن میں اورنگ زیب اور گجرات میں مراد بھی خاموش نہیں بیٹھے ۱۶۵۷ء نومبر میں مراد نے گجرات کے صدر مقام احمد آباد میں بادشاہت کا اعلان کر دیا اور اسی سال دسمبر میں دربار منعقد کر کے خیر خواہوں اور افسروں کو مناصب و خطابات عطا کئے، چوں کہ تخت و تاج حاصل کرنے تک زر کثیر کی ضرورت تھی احمد آباد کے نگر سیٹھ شانتی داس سے مراد نے پانچ لاکھ پچاس ہزار روپیہ قرض لیا اور اپنے خاندان کے تمام افراد کو قلعہ چانپانیر میں چھوڑتا ہوا سورت کی طرف بڑھا۔ سورت کے قلعہ پر قبضہ کر کے اس شہر سے قریب سات لاکھ روپیہ فراہم کیا۔ مراد نے اسی اثنا میں ایران سے بھی ساز باز شروع کی اور اس کام کو انجام دینے کے لئے تقرب خان کو ایران روانہ کیا۔

اورنگ زیب نے اب تک اس بارے میں کوئی اقدام نہ کیا۔ دارا کو اگر کسی کا خوف تھا تو وہ اورنگ زیب کا تھا۔ دارا نے اورنگ زیب کو تنہا کرنے کے خیال سے دکن سے بڑے بڑے افسروں کو دہلی چلے آنے کا حکم دیا۔ مہابت خاں چھتر سال وغیرہ تو اورنگ زیب کو بلا اطلاع دئے دکن سے دار الخلافہ کی طرف روانہ ہو گئے جب کہ بیجاپور کی مہم میں اورنگ زیب الجھا ہوا تھا۔ ان حالات میں بھی اورنگ زیب نے ظاہراً طور پر شاہجہاں کو شکایت کا موقع نہیں دیا مگر اپنی تیاری میں بھی کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا۔ اورنگ زیب نے ایک طرف میر جملہ کو اپنا طرفدار بنا لیا اور دوسری طرف مراد سے نامہ و پیام کا سلسلہ شروع کیا۔ اور دونوں بھائیوں میں ملک کی تقسیم کے لئے عہد و پیمان بھی ہو گئے مراد بخش گجرات سے اوجین کی طرف بڑھا اور دکن سے اورنگ زیب

نے طبل کوچ بجایا۔ ۱۶۵۸ء کے ماہ اپریل میں اورنگ زیب اور اُدھر سے مراد بخش دیبال پور پہنچے دونوں شہزادوں نے یک جہتی و یگانگت کا اظہار کیا عہد و پیمان بالمشافہ طے ہوئے اور دیبال پور سے دونوں اوجین کی طرف بڑھے۔

شاہجہاں نے آگرہ سے راجہ جسونت سنگھ اور دوسرے اعلیٰ افسروں کی کمان میں ایک فوج اجین روانہ کی۔ راجہ کو شاہجہاں نے یہ ہدایت کی تھی کہ جنگ و جدل سے قبل شہزادوں کو تمام حجت کے طور پر ہر طرح صورتِ حال سمجھائی جائے۔ اگر شہزادے واپس لوٹ جائیں تو بہتر ورنہ بصورت دیگر شمشیر کے زور سے اقدام کو روکا جائے راجہ جسونت سنگھ اور قاسم خاں اجین کے قریب پہلے ہی سے مقام دھرمات تجویز کر چکے تھے جب اورنگ زیب اور مراد کی فوجوں کی آمد کا غلغلہ سنا تو راجہ کو فکر لاحق ہوئی۔ اور اورنگ زیب جیسے کار دیدہ کے مقابلہ میں پہلے پس و پیش کرنے لگا لیکن چار و ناچار اسے صف آرا ہونا پڑا۔ عاقل خاں کا بیان ہے کہ اورنگ زیب نے راجہ کو پیغام بھیجا کہ شہزادگان کا مقصد جہاں پناہ کی عیادت کے لئے آستانہ پر حاضری دینا ہے اس لئے مناسب یہ ہے کہ وہ جنگ کا ارادہ ترک کر دے لیکن راجہ نے جواب میں کہلا بھیجا کہ چونکہ وہ اسی امر خاص کے لئے بھیجا گیا ہے اور اس کا واپس جانا جہاں پناہ کی خوشنودی کا باعث نہ ہوگا۔ اگر آنحضرت (اورنگ زیب) دکن کی طرف مراجعت کریں تو وہ واپس لوٹ جائے اور اگر آنحضرت اس بات پر راضی نہیں تو گستاخی کے لئے معذور رہوں۔

بالآخر دوسرے روز صبح دونوں فوجیں صف آرا ہوئیں اور نقارۂ جنگ گونجنے لگا میدان کارزار گرم ہوا نصف النہار تک راجپوت بڑی جانبازی سے لڑے

مگر اس وقت تک شاہی فوج کے کئی مسلمان اور راجپوت سردار کام آچکے تھے۔ راجہ جسونت سنگھ نے جب ہاتھ سے بازی جاتے دیکھی تو خلاف رسم جوانمردی میدان کارزار چھوڑ دیا اور شرمندگی کی وجہ سے آگرہ جانے کے بجائے مالوہ چلا گیا۔ شاہی فوج نے بھی میدان سے بھاگنا شروع کر دیا اور تھوڑی دیر میں اورنگ زیب کی فوج میں فتح و نصرت کا غلغلہ بلند ہوا۔

شاہجہاں اس دوران میں دہلی جا رہا تھا راستہ ہی میں اسے شکست کی خبر ملی۔ دارا کے اصرار پر شاہجہاں آگرہ کو لوٹ گیا۔ اگرچہ شاہجہاں اس خون ریزی کو کسی طرح روکنے کے خیال سے خود اپنی فوج ظفر موج کے ساتھ میدان جنگ میں جانا چاہتا تھا اس صورت میں شاہجہاں کو یقین تھا کہ شہزادے اس کے مقابلہ میں ہتھیار ڈال دیں گے مگر دارا کی کوتاہ اندیشی کی وجہ سے شاہجہاں اپنے خیال کو عملی جامہ پہنا نہ سکا۔ شاہجہاں دارا کے ہاتھ میں گویا قید تھا اور کچھ نہ کر سکتا تھا۔ دارا نے اس خیال سے کہ وہ اورنگ زیب کو بہ آسانی شکست دے دیگا فوراً کوچ کے لئے تیاری کا حکم دیا۔ دارا نے قلعہ سے چلتے ہوئے فاتحہ خیر پڑھا اور قدم بوسی بجا لایا۔ شاہجہاں قلعہ پر سے بڑی دیر تک اپنے چہیتے بیٹے کی روانگی پر فوج کے جاہ و حشم کا نظارہ کرتا رہا۔ دارا ۱۶۵۸ء کی ۱۸ مئی کو ایک لاکھ فوج کے ساتھ دھول پور کی طرف روانہ ہوا دھول پور پہنچ کر اس مقام کے زمینداروں کی مدد سے دریائے چمبل کے راستوں اور گھاٹیوں پر توپیں نصب کرا دیں تاکہ تمام راہیں مسدود ہو جائیں اور اورنگ زیب دریائے چمبل عبور نہ کر سکے لیکن اورنگ زیب دارا سے بہت زیادہ دور بین اور تجربہ کار تھا اس نے ایک غیر معلوم راستہ سے فوج کے ساتھ دریا

عبور کر کے سموگڈھ میں مقام کیا۔ اس اثنار میں جہاں آرا نے خط کے ذریعہ اورنگ زیب کو سمجھانے کی بڑی کوشش کی مگر اورنگ زیب اس سے متاثر نہ ہوا اور خط کا نہایت معقول جواب لکھ بھیجا۔ ۱۶۵۸ء کی ۲۹ مئی کو صبح مخالف فوجیں میدان میں صف آرا ہوئیں۔ دارا نے بہت زوروں سے اورنگ زیب کے لشکر پر حملہ کیا۔ اورنگ زیب چونکہ نبرد آزما تھا مدافعانہ لڑتا رہا۔ راجپوت سرداروں نے باری باری سے مراد اور اورنگ زیب کے ہاتھیوں پر مردانہ وار حملے کئے مگر ان میں سے ایک بھی اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہوا اور ہر ایک نے اپنی جان سے ہاتھ دھویا۔ جب اورنگ زیب نے دارا کی فوج کی بے ترتیبی دیکھی تو جارحانہ حملہ کر دیا۔ میدان میں دارا کا ہاتھی قابو سے باہر ہو گیا دارا نے فوراً ہاتھی چھوڑ دیا اور گھوڑے پر سوار ہو گیا۔ دارا نے میدان میں یہ اجتہادی غلطی کی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جیسے ہی سپاہیوں نے دارا کے ہاتھی کا ہودہ خالی پایا تو سمجھے کہ دارا کام آچکا ہے۔ سپاہی بد دل ہوئے اور میدان چھوڑنا شروع کر دیا۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ خود دارا کو بھی میدان چھوڑنا پڑا۔ دارا رات ہی رات آگرہ پہنچا اور اپنی حویلی میں تھوڑی دیر توقف کیا۔ شاہجہاں کو اس شکست کی اور دارا کی آمد کی اطلاع پہنچی تو اس نے دارا کو طلب کیا مگر دارا نے حاضری سے پہلوتہی کی اور اسی رات پچھلے پہر دہلی روانہ ہو گیا۔

اورنگ زیب اس فتح کے بعد دوسرے ہی روز آگرہ پہنچا اور شہر کے قریب اپنی مظفر و منصور فوج کے ساتھ باغ نور محل میں قیام کیا جہاں کہ بخت و فیروزی اورنگ زیب کے آستانہ پر ناصیہ فرسا تھے شاہی ملازمین و مقربین اس ابوالمظفر کے در دولت پر تحفہ مبارک باد لے کر پہنچتے اور انعام و منصب سے سرفراز

ہوتے۔ شاہجہاں نے اورنگ زیب کے ساتھ نامہ و پیام کا سلسلہ جاری کیا اسی موقع پر شاہجہاں نے تحفتہً ایک شمشیر بھیجی تھی جس پر عالمگیر کندہ تھا۔ اورنگ زیب باپ کی قدمبوسی کے لئے جانے کا ارادہ کر چکا تھا لیکن چند معتبر ذرائع سے اسے معلوم ہوگیا کہ شاہجہاں کی نیت میں فتور ہے اس لئے اورنگ زیب نے ارادہ بدل دیا اور قلعہ کے محاصرہ میں سختی کر دی اور رسد پر بھی پہرے لگا دئے۔ جب شاہجہاں نے ہر طرح اپنے آپ کو عاجز و مجبور پایا تو بادل ناخواستہ قلعہ کی چابیاں اورنگ زیب کے حوالے کر دیں۔ اورنگ زیب نے قلعہ کا قبضہ لیا شاہجہاں کو قید کیا اور زمام حکومت اپنے ہاتھ میں لے لی۔

شاہجہاں دارا کی محبت میں اس قدر دیوانہ تھا کہ بہ حالت قید و بند بھی اس نے پنجاب کے صوبیدار مہابت خاں کو لکھ بھیجا کہ وہ دارا کی اعانت و استعانت میں کمی نہ کرے۔ ادھر اورنگ زیب کے بیٹے محمد سلطان کو بہکانا شروع کیا کہ وہ اپنے چچا شجاع سے ساز باز کر کے اورنگ زیب کا کام تمام کر دے مگر شاہجہاں اپنی ان کوششوں میں کامیاب نہ ہوا۔ کہا جاتا ہے کہ آخری زمانہ میں اورنگ زیب کی طرف سے شاہجہاں کا دل صاف ہو گیا تھا۔ اور شاہجہاں کی وفات یعنی ۱۶۶۶ء تک آپس میں تعلقات خوش گوار رہے۔

سموگڈھ کی جنگ میں ظفر یابی اور سیاست دانی نے اورنگ زیب کے اثر و اقتدار کو دوبالا کر دیا تھا۔ یہ بات مراد کو کھٹکنے لگی ادھر حاشیہ نشینوں نے اورنگ زیب کے خلاف مراد کے کان بھرنا شروع کیا کہ اورنگ زیب کا قصد دہلی مصلحت سے خالی نہیں وہاں پہنچ کر یہ اپنی بادشاہت کا اعلان کرنا چاہتا ہے اور حقیقت کی

بنیاد اس بات پر رکھی کہ اورنگ زیب نے اسے آگرہ میں کچھ دن آرام و استراحت میں بسر کرنے کا مشورہ دیا تھا چوں کہ مراد جنگ سموگڈھ میں بہت زخمی ہو گیا تھا۔ مراد سادہ لوح تھا، باتوں میں آگیا اور اورنگ زیب کے پیچھے پیچھے اپنے لشکر کے ساتھ منزلیں طے کرتا رہا۔

مراد کی حرکات و سکنات دیکھ کر اورنگ زیب کو اس کے بہی خواہوں نے یہ مشورہ دیا کہ ابھی زیادہ اہم کارگذاری درپیش ہے اور مراد بخش کی حرکتیں باعث تردد ہیں اس لئے شہزادے کو قید کر دیا جائے۔ اورنگ زیب نے مراد کو صلاح و مشورہ اور شوق ملاقات کے بہانہ سے یاد کیا مراد بھی فوراً جانے کے لئے آمادہ ہو گیا لیکن اس کے ہواخواہوں نے یہ کہہ کر جانے سے باز رکھا کہ اورنگ زیب کی نیت خراب ہے۔ اس وقت مشیروں کے اصرار پر مراد نہیں گیا مگر ایک روز اورنگ زیب کا نورالدین نامی ایک خادم مراد کے خیمہ میں پہنچا اور یہ اطلاع دی کہ اورنگ زیب شدید درد شکم میں مبتلا ہے اور وہ اپنے بھائی کے شوق ملاقات میں تڑپ رہا ہے مراد اپنی سادہ لوحی کی وجہ سے اس خبر کی بلا تصدیق کئے فوراً اورنگ زیب کے خیمہ پر پہنچا۔ یہاں بڑے تپاک سے مراد کا استقبال کیا گیا اس کے ملازمین کو اندر جانے نہ دیا گیا اور مراد کو اندر لے جایا گیا۔ خود اورنگ زیب تعظیم کو اٹھا کچھ دیر گفتگو ہونے کے بعد مراد کے سامنے شاہی ماحضر پیش کیا گیا اور طے پایا کہ قیلولہ کے بعد مجلس مشورت منعقد کی جائے گی مراد نے کمر سے اپنے سلاح کھول کر الگ رکھ دئے اور بستر استراحت پر دراز ہو گیا اس دوران میں ایک کنیز نے آکر سلاح اٹھا لئے افسر جو اس موقع کے منتظر تھے ارد گرد جمع ہو گئے۔ جب مراد نے آنکھیں کھولیں تو اپنے بخت کو خفتہ پایا۔

مراد نے اپنے آپ کو بے بس دیکھ کر کہا کہ میرے ساتھ یہ سلوک کیا اور وہ عہد و پیمان جو قرآن کریم کو ضامن رکھ کر کئے گئے تھے خوب بجا لائے اورنگ زیب نے جو پس پردہ کھڑا تھا اس کا جواب دیا کہ یہ جو کچھ کیا گیا ہے اس کا مقصد محض اپنے بھائی کے سر سے غرور و نخوت دور کرنا ہے اور ہمارا یہ خیال ہے کہ کچھ دن آپ صبر و سکوت سے گزاریں۔ اس کے بعد مراد کو گوالیار کے قلعہ میں پہنچا دیا گیا۔ مراد کی فوج میں جب یہ خبر پہنچی تو لوگ بہت دل برداشتہ ہوئے اور آخر آہستہ آہستہ اورنگ زیب کے لشکر میں شامل ہو گئے۔

مراد چار سال قید و بند میں رہا۔ ایک روز اس کے بہی خواہوں نے اس کو قید سے چھڑانے کے لیے قلعہ کی فصیل پر سے اترنے کا انتظام کیا۔ مراد قلعہ چھوڑنے سے پہلے اپنی محبوبہ سرسوتی بائی سے (جو اورنگ زیب کی اجازت سے قید خانہ میں مراد کے ساتھ رکھی) آخری بار ملنے گیا جب سرسوتی مراد کے ارادہ سے آگاہ ہوئی تو بے اختیار چیخ اٹھی اس کی آواز سے پہرہ دار جاگ اٹھے اور یہ بھاگ نکلنے میں ناکام رہا۔

اورنگ زیب اس خبر سے متفکر ہوا مراد کا کام تمام کرنے کے لئے آخر کار علی نقی خاں جس کو گجرات میں مراد نے قتل کر دیا تھا کے بیٹے کو عدالت میں مراد پر اپنے باپ کے خون کے سلسلے میں مقدمہ دائر کرنے پر راضی کر لیا۔ مقدمہ کا فیصلہ مراد کے خلاف دیا گیا اور اس طرح دسمبر ۱۶۶۱ء میں نامراد مراد کو قتل کر دیا گیا۔

دارا نے اورنگ زیب کے دہلی کی طرف بڑھنے کی اطلاع ملتے ہی دہلی سے لاہور کا رخ کیا۔ لاہور میں دارا کا پرانا نمک خوار غیرت خاں موجود تھا جس نے اس کی کافی مدد کی۔ شاہی خزانہ سے دارا کو ایک کروڑ روپیہ دستیاب ہوا۔ سرہند میں اسے ایک

زمیندار افسر کا دفینہ ہاتھ لگنے سے بارہ لاکھ روپیہ مل گیا اب اس نے فوج فراہم کرنا شروع کیا اور تقریباً دس ہزار سپاہی اس کے پرچم کے نیچے جمع ہو گئے اگرچہ دارا کا خیال تھا کہ اورنگ زیب دو جنگیں لڑ چکا ہے اور اس صورت میں اس کا پنجاب جلد پہنچنا دشوار ہے تاہم دارا نے دریائے ستلج پر پہرے بٹھلا دئے تاکہ اورنگ زیب اسے عبور نہ کر سکے۔ اورنگ زیب دہلی پہنچا اور ۱۶۵۸ء میں تاریخ ۲۱ جولائی مختصر طور پر رسم تخت نشینی ادا کی گئی اور دربار منعقد کر کے افسران خیر اندیش کو مناصب و انعامات عطا کئے۔

اگست کے وسط میں دارا کے خلاف توقع دریائے ستلج عبور کر لیا۔ دارا ہمت ہار گیا اور فوج کے ساتھ ملتان چلا گیا مگر یہاں بھی اسے عافیت نصیب نہ ہوئی۔ اورنگ زیب نے تین ہفتہ لاہور میں قیام کیا اور نظم و نسق کی دیکھ بھال کی اور دارا کے تعاقب میں مختلف افسروں کی کمان میں فوجیں روانہ کر دیں۔ دارا سندھ کے ریگستان میں تین ماہ بھٹکتا رہا۔ سفر کی صعوبتوں سے گھبرا کر اور کچھ دارا سے مایوس ہو کر اس کے وفا شعار افسروں نے بھی اس کا ساتھ چھوڑ دیا۔ اس میں دارا کی فوج چودہ ہزار سے سات ہزار اور آخر میں تین ہزار باقی رہ گئی۔ دارا سندھ سے کچھ کی طرف گیا اور کاٹھیاواڑ ہوتا ہوا گجرات چلا آیا۔

شکست خوردہ دارا صحرا نوردی کر رہا تھا مراد قید ہو چکا تھا، اورنگ زیب آگرہ سے بہت دور تھا اور قلعہ اکبر آباد ایک ناتجربہ کار شہزادہ محمد سلطان کے قبضہ میں تھا شجاع نے ان حالات کے پیش نظر دوبارہ قسمت آزمائی کا خیال کیا۔ یہ پٹنہ سے کثیر التعداد فوج کی ہمراہی میں آگرہ کی طرف بڑھا۔ اورنگ زیب نے یہ صورت حال دیکھ کر محمد سلطان کو شجاع کے مقابلہ میں بڑھنے کا حکم دیا اور خود بھی منتخب فوج کے ساتھ الہ آباد کی طرف بڑی سرعت کے ساتھ منزلیں طے کرتا ہوا پہنچا۔ اسی اثنا میں دکن سے میر جملہ بھی اپنی فوج

کے ساتھ آگیا تھا۔ ادھر شجاع پٹنہ سے الہ آباد کی طرف بڑھا الہ آباد کا قلعہ دارا کے ایما سے اس کے افسروں نے شجاع کے حوالے کر دیا اسی طرح بنارس چنار وغیرہ جو ابتک دارا کے افسروں کے قبضہ و تصرف میں تھے شجاع کے لئے معاون و مددگار ثابت ہوئے۔ آخرالامر مقام کھجوا پر دونوں حریف فوجوں نے قیام کیا۔ اس مقام پر اورنگ زیب نے اپنی فوجوں کو ترتیب دیا۔ دو روز کی جنگ و جدل کے بعد شجاع نے ہزیمت اٹھائی۔ اور میدان چھوڑ کر بھاگا غرض جنوری ۱۶۵۹ء میں اورنگ زیب نے اپنے دوسرے بڑے مخالف کو ہمیشہ کے لئے میدان سے نکال دیا۔

شجاع کے تعاقب میں میر جملہ کو بھیجا گیا تھا۔ اگرچہ شجاع شکست خوردہ تھا لیکن اس کے باوجود اورنگ زیب کے افسروں کو تقریباً ڈیڑھ سال پریشان کرتا رہا تاوقتیکہ شجاع نے ہر ایک راہ اپنے پر مسدود پاکر ۱۶۶۰ء میں بتاریخ ۱۲ مئی ہندوستان کو ہمیشہ کے لئے خیرباد کہا اور اہل و عیال کے ساتھ آراکان چلا گیا۔ جہاں سے شہزادہ کے حشر سے مورخ لاعلمی ظاہر کرتے ہیں مگر کہا جاتا ہے کہ شجاع اس مقام کے راجہ کو قتل کرنے کی سازش میں پکڑا گیا اور آخرکار قتل کر دیا گیا۔

پہلے ہم بیان کر چکے ہیں کہ دارا کچھ سے گجرات چلا گیا۔ احمد آباد میں شاہ نواز خاں نے جو اورنگ زیب کا متعین کردہ صوبہ دار تھا غداری کی اور شاہی خزانہ دارا کے سپرد کر دیا۔ دارا نے گجرات میں ڈیڑھ ماہ قیام کر کے فوج فراہم کی اور اجمیر کی طرف بڑھا۔ ہر چند دارا کے ساتھ کثیر فوج تھی لیکن اس کے لئے اورنگ زیب جیسے جرنیل اور سیاست داں کے مقابلہ میں لڑنا مشکل تھا اجمیر کی جنگ میں مارچ ۱۶۵۹ء میں شکست فاش کھائی جس کے بعد دارا کو فرار کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ دارا سندھ ہوتا ہوا قندھار

جانا چاہتا تھا اورنگ زیب کا لشکر اس کے تعاقب میں تھا۔ اس کے اچھے افسروں نے اس کا ساتھ چھوڑنا شروع کیا ادھر سپاہیوں نے بھی دارا کے خیمے لوٹنا شروع کیا۔ دارا نے ٹھٹھا دادر میں اپنے ایک قدیم پروردہ زمیندار ملک جیون کے یہاں پناہ لی مگر بخت نے یاوری نہ کی۔ اس نمک حرام نے قدیم احسانات کا بھی خیال نہ کیا اور دارا کو گرفتار کر لیا۔ اور راجہ جے سنگھ اور بہادر خاں کے حوالہ کر دیا۔ ۲۳ اگست ۱۶۵۹ء میں دارا کو دہلی لایا گیا اور ۳۰ اگست کو یہ بدنصیب شہزادہ قتل کر دیا گیا۔ سلیمان شکوہ الہ آباد سے یہ وقت تمام سرینگر پہنچا۔ یہاں راجہ نے اس سے اچھا سلوک کیا مگر اورنگ زیب نے ہندو افسروں کی مدد سے سلیمان کو حاصل کر لیا۔ سلیمان پہلے تو قید میں رکھا گیا۔ ایک سال کے بعد سلیمان شکوہ مئی ۱۶۶۲ء میں قید اور اورنگ زیب اور قید حیات دونوں سے آزاد ہو گیا۔

کھجوا اور اجمیر میں فتح و نصرت پانے کے بعد اورنگ زیب نے ۱۶۵۹ء کے وسط میں دوبارہ تقریب تخت نشینی بہت ہی تزک و احتشام کے ساتھ منائی۔ ۱۲ مئی کو شہر دہلی میں بڑی شان و شوکت سے جلوس نکالا گیا جو قلعہ کے لاہوری دروازہ سے قلعہ میں داخل ہوا۔ دیوان عام و دیوان خاص میں آراستگی کا پورا اہتمام کیا گیا۔ دربار میں اہل دربار اور منجموں کی تجویز کردہ نیک ساعت کے منتظر تھے۔ مسعود ساعت آ پہنچی اورنگ زیب پردہ کے پیچھے سے نکل کر تخت پر جلوہ افروز ہوا۔ اہل دربار کے چہروں پر مسرت و انبساط کی لہریں دوڑ گئیں۔ اہل دربار تسلیمات بجالائے اور تبریک تہنیت پیش کی شعراء نے تہنیتی قصیدے پڑھے شہنشاہ اورنگ زیب نے مناصب و انعامات تقسیم کیے۔ شاہی ملازموں نے گلاب پاشی کی اور پان تقسیم ہوئے۔ دارالضرب میں

فوراً سکہ ضرب کیا گیا۔ بادشاہ کے نام کا خطبہ پڑھا گیا۔ اور کئی دن تک آتش بازی سے دہلی کی راتیں دن میں تبدیل ہو گئیں بغرض اس رسم کو بڑی شان و شوکت کے ساتھ ادا کیا گیا۔

اس دو سال کی جنگ و جدل سے ملک کو بہت نقصان پہنچا۔ تمام قلمرو میں نظام حکومت درہم برہم ہو گیا تھا۔ شاہی ملازم خود مختاری سے کام لے رہے تھے۔ شہزادوں نے صوبوں کے شاہی خزانے خالی کر دئے تھے۔ لشکروں کی نقل و حرکت نے ملک کی زراعت کو سب سے زیادہ نقصان پہنچایا فوجوں نے اپنی ضرورتیں پوری کرنے کے لئے کھیتوں میں تیار فصلیں کاٹ لیں جس کی وجہ سے غلہ کی قلت ہو گئی اور گرانی کی وجہ سے غریب بھوکوں مرنے لگے ہر طرف چوری ڈاکہ کی کثرت نے بدامنی اور بے چینی پھیلا رکھی تھی۔ تجارت کی منڈیاں سرد پڑی ہوئی تھیں غرض یہ دو سال کا عرصہ اہل ہند کے لئے بڑا آزمائش کا زمانہ تھا۔ اورنگ زیب تخت نشینی کے بعد سب سے پہلے تنظیم و ترتیب قائم کرنے کی طرف متوجہ ہوا۔ اور فرامین کے ذریعہ ہر صوبہ میں شاہی ملازموں کے نام احکامات بھیجنا شروع کیا۔ ایسا ایک فرمان ۱۶۶۵ء میں گجرات کے اعلیٰ افسروں کے نام صادر ہوا تھا اس فرمان والا شان میں ۳۶ شقیں ہیں۔ اس فرمان کی چند شقیں اقتصادی حالات کے پیش نظر محصولات کی معافی سے متعلق ہیں اور اس کا ایک حصہ اخلاقی و مذہبی اصلاحات سے تعلق رکھتا ہے معاقی خان کے بیان کے مطابق قریب اسّی محصول معاف کر دئے گئے تھے۔ اسی طرح فرامین سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اورنگ زیب ابتدا سے ملک کی صنعتوں کا بڑا خیال رکھتا اور انھیں ترقی دینے میں حوصلہ افزائی کرتا۔ غرض اورنگ زیب نے بہت

قلیل عرصہ میں اپنے اثر و اقتدار سے ملک کا نظم و نسق ایک حد تک درست کرلیا تھا۔ ورنہ ابتدائی دور کی محض شورشیں ہی ایسی سخت تھیں جو حکومت کا تختہ الٹ دیتیں۔

عہد اورنگ زیب کو دو بڑے حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے پہلا حصہ شمالی ہند کے واقعات سے تعلق رکھتا ہے جیسے آسام و کوچ بہار کی جنگیں بہار اور اڑیسہ کے زمینداروں کے فسادات، جاٹوں کی شورش، راجپوتوں کی سرکشی سکھوں کے مقابلے اور سرحدی پٹھانوں کی لوٹ مار وغیرہ اس دور کا نصف ثانی دکن سے تعلق رکھتا ہے۔ خود اورنگ زیب نے پچیس سال دکن میں گذارے گویا شمالی ہند سے پایۂ تخت دکن میں منتقل ہوگیا تھا۔ اگرچہ خود اورنگ زیب دکن میں اس طویل مدت کے قیام سے نہ اکتا گیا ہو لیکن اہل دربار، فوجی افسر اور شاہی ملازمین کو وطن کی یاد نے بیتاب کر دیا تھا۔ دکن کی مہمیں اورنگ زیب کی عہد کی تمام مہموں سے زیادہ اہمیت رکھتی ہیں یہی وہ زمانہ ہے جب کہ شیواجی نے اپنی قوم کو منظم کیا اور ایک نئی حکومت کی بنیاد ڈالی۔

اس دور میں بڑی جنگوں کو چھوڑ کر دو قسم کی شورشیں پائی جاتی ہیں چند فسادات محض مقامی تھے جنہیں مقامی افسروں نے فرو کر دیا۔ دوسری قسم کی شورشیں وہ ہیں جو باج گذار ریاستوں اور چھوٹی چھوٹی جماعتوں کے سرداروں نے برپا کیں۔ جن پر قابو پانے کے لئے شاہی فوجوں کو متعین کرنا پڑا۔

مقامی بلوؤں سے حکومت کو کوئی خاص نقصان نہ پہنچا۔ صرف تھوڑی مدت کے لئے ان مقامات کا نظم و نسق درہم برہم ہوجاتا تھا۔

۱۶۵۹ء میں متھرا کے نواحی علاقہ میں راجپوتوں نے ایک بہادر پنج نامی شخص کی سرداری میں بلوہ کیا۔ ۱۶۶۰ء میں چکرسین بھیل نے میوات میں فساد برپا کیا، ۱۶۶۲ء نیازئی سرحدیوں نے دریائے سندھ عبور کر کے بعض مغل علاقوں میں لوٹ مار کی ۱۶۶۵ء میں ہمیر سین نے شاہ آباد میں ۱۶۶۷ء میں جموں کے راجہ نے اور ۱۶۶۹ء میں گونڈ زمیندار بھوپل سنگھ نے فساد برپا کیا۔

اسی طرح الہ آباد، بہار اور اڑیسہ کے زمینداروں نے بغاوت پر کمر باندھی مگر ان تمام فسادات کو بہت جلد دبا دیا گیا۔

چند باج گذار رئیسوں نے بھی ابتدائی دور کی بدنظمی سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی پوری کوشش کی بیکانیر کا راؤ کرن شاہجہاں کے عہد حکومت کے آخری سالوں میں دکن کی مہم پر بھیجا گیا تھا مگر اورنگ زیب کے عہد میں اس نے اطاعت سے منہ موڑا۔ اورنگ زیب نے ۱۶۶۰ء میں اس کی تادیب کے لئے نو ہزار کا لشکر بھیجا راؤ تاب مقاومت نہ لایا اور معافی کا خواستگار ہوا۔ اورنگ زیب نے درخواست قبول کی اور منصب عطا کر کے دکن کی مہم پر روانہ کر دیا۔ ۱۶۵۹ء میں چمپت رائے بندیلے نے خود مختاری کا اعلان کیا۔ اورنگ زیب نے اس کے خلاف راجپوت سرداروں کو بھیجا۔ چمپت رائے مغلوں کے مقابلہ میں شکست کھا کر فرار ہو گیا اور مدت تک صحرا نوردی کرتا رہا اور جب بے بس ہو گیا تو خودکشی کر لی لیکن راجہ جے سنگھ کی کوشش سے اس کے بیٹے چھترسال نے اورنگ زیب کی اطاعت قبول کر لی۔ اسے فوج میں شامل کر کے شیواجی کے خلاف دکن کی مہم پر بھیج دیا گیا۔ دکن میں چھترسال نے شیواجی سے ساز باز کی اور آخر کار اپنے وطن واپس آیا جہاں ڈاکوؤں

کی زندگی بسر کرتا رہا۔

اورنگ زیب کے ابتدائی عہد میں سرحدیوں نے بھی لوٹ کھسوٹ شروع کی لیکن ان کو بہت جلد مطیع کر لیا گیا۔ ۱۶۶۷ء میں ایک یوسف زئی بھگو نامی افغان نے ایک شخص کو محمد شاہ کا لقب دے کر بادشاہ بنایا اور خود وزیر بن بیٹھا اور ضلع ہزارہ اور اٹک کو لوٹا اور ان مقامات پر قبضہ بھی کر لیا مگر بہت جلد ان کے قلع قمع کے لئے مغل فوجیں روانہ کی گئیں۔ جنگ میں یوسف زئی زیادہ دیر ٹھہر نہ سکے۔ اس کے بعد ان طائفوں کے بڑے بڑے سرداروں کو تحفے تحائف اور تنخواہیں دے کر زیر کیا گیا۔ اس شورش کے بعد ۱۶۷۲ء تک کوئی خاص واردات پیش نہیں آئی۔ چوں کہ سرحد پر کسی قابل اور تجربہ کار فوجی افسر کی ضرورت تھی اس لئے ۱۶۷۱ء کے وسط میں راجہ جسونت سنگھ کو درۂ خیبر کے قریب مقام جمرود کا فوجدار بنا کر بھیجا گیا تھا۔

۱۶۷۲ء میں جلال آباد کے فوجدار کی حرکتوں سے سرحد کے آفریدی مغلوں کے خلاف ہو گئے اور اکمل خاں نامی ایک آفریدی کی سرداری میں مغلوں کے خلاف علم بغاوت بلند کیا۔ ۱۶۷۲ء کے موسم بہار میں محمد امین بن میر جملہ جو افغانستان کا صوبہ دار تھا پشاور سے کابل جا رہا تھا۔ راستہ میں اسے اطلاع ملی کہ آفریدیوں نے راستے بند کر دئے ہیں محمد امین ان اطلاعات کو اہمیت نہ دیتے ہوئے آگے بڑھا لیکن محمد امین اور اس کے لشکر کو آفریدیوں نے اتنا تنگ کیا کہ آخر اس نے آفریدی سرداروں کے ساتھ صلح کے لئے گفت و شنید شروع کی مگر اس میں بھی کامیابی نہیں ہوئی۔ اس کے بعد محمد امین نے آفریدیوں کے خلاف فوج کے دستے

بھیجنا شروع کیا۔ مگر اس جنگ میں مغل لشکر نے ہزیمت اٹھائی اور محمد امین اور فوجی اپنی جان بچا کر پشاور واپس آ گئے۔ اس جنگ میں آفریدیوں کے ہاتھ تقریباً دو کروڑ روپیہ لگا اور دس ہزار مغلوں کو غلام بنا کر لے گئے اور ایشیائے وسط میں ان غلاموں کو فروخت کیا۔ محمد امین خان کو اس جگہ سے بدل کر گجرات بھیج دیا۔ اور گجرات سے مہابت خاں کو افغانستان کی صوبہ داری کے لئے نامزد کیا۔ مہابت خاں سرحدیوں کے خوف سے ہراساں تھا اور کابل جانے میں پس و پیش کر رہا تھا اورنگ زیب نے دہلی سے شجاعت خان کو لشکر کے ساتھ روانہ کیا۔ مگر شجاعت خان اور راجہ جسونت سنگھ میں اختلاف رائے ہونے کی وجہ سے اس مہم میں مغلوں کو بڑا نقصان ہوا۔ آخر ۱۶۷۴ء کے وسط میں اورنگ زیب خود گیا اور ڈیڑھ سال حسن ابدال مقام پر قیام کر کے اپنی سیاست دانی اور فوجی لیاقت سے سرحدیوں کو زیر کیا۔

بنگالہ کا نظم و نسق ۱۶۵۸ء ہی سے درہم برہم ہو گیا تھا۔ شہزادگان کی جنگ کے دوران میں آسام، کوچ بہار اور برما کی سرحدوں کے لوگوں نے بدنظمی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مغلیہ مملکت کے کچھ حصہ پر قبضہ کر لیا تھا اور ڈھاکہ کے قریب تک پہنچ گئے تھے۔ ۱۶۶۱ء جون میں میر جملہ کو بنگالہ کا صوبہ دار مقرر کیا، میر جملہ نے جاتے ہی راشد خان کو آسام کی سرکوبی کے لئے روانہ کیا اور کوچ بہار پر تجان رائے کو بھیجا اور بعدہٗ خود میر جملہ کوچ بہار کی طرف بڑھا۔ میر جملہ نے کوچ بہار کی ریاست کو مغلیہ قلمرو میں شامل کر لیا اور اس مقام پر سولہ روز قیام کر کے آسام کی طرف بڑھا۔ آسام مغلوں کے مقابلہ میں کئی مہینے لڑتا رہا۔ میر جملہ کی فوج کو سیلاب، گھنے جنگل اور وبا کے پھیلنے کی وجہ سے بڑا نقصان پہنچا لیکن میر جملہ کے ارادوں میں تزلزل

پیدا نہ ہونے پایا آخر صلح کے معاہدے پر اس جنگ کا خاتمہ ہوا مگر پوری طور پر آپس کے کھچاؤ اور کدورتوں کا خاتمہ نہ ہوا تھا اس لئے ۱۶۶۷ء سے ۱۷۰۰ء تک وہ بارہ مغلوں اور آسامیوں میں جنگ ہوتی رہی بنگالہ کی آب و ہوا اور جنگ آسام میں تکالیف کی شدت نے میر جملہ کی صحت پر بہت برا اثر کیا اور یہ آسام سے ڈھاکہ جاتے ہوئے راستہ میں انتقال کر گیا۔

میر جملہ کے انتقال کے بعد شائستہ خاں کو بنگالہ بھیجا گیا۔ عرصہ دراز سے چاٹ گاؤں کے فرنگی اور آراکانی بحری ڈاکوؤں نے بنگالہ کی بندرگاہوں میں اودھم مچا رکھی تھی۔ یہ ڈاکو بنگالہ کے شہر دیہات اور بندرگاہیں لوٹتے اور کثیر تعداد میں بنگالیوں کو غلام بنا کر لے جاتے اور بیچتے یا کاشتکاری میں ان سے کام لیتے۔ ڈاکو مال غنیمت میں سے نصف حصہ آراکان کے راجہ کو دیتے اور نصف خود لیتے جب شائستہ خان نے دیکھا کہ ان ڈاکوؤں کے ظلم و ستم سے بنگالہ کے دیہات اور شہر ویران ہوتے چلے جا رہے ہیں تو اس نے ڈاکوؤں کا قلع قمع کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا۔ ابتدا میں ان سے جنگیں لڑا لیکن فرنگی ڈاکوؤں کو اپنی طرفداری میں لے کر آخر کار چاٹ گاؤں بھی فتح کر لیا۔ اور اس طرح ۱۶۶۶ء میں ان بحری ڈاکوؤں کو بالکل نیست و نابود کر دیا۔

اورنگ زیب کی مذہبی اصلاحات، اور اس بارے میں اس کے طرز عمل سے ہندو رعایا ناخوش تھی اور اس کی آڑ میں اکثر شر پسند عنصر بغاوت پر کمر باندھتا اور علاقہ کے امن کو بری طرح غارت کر دیتا۔ اورنگ زیب کے افسر بھی اپنے بادشاہ کی خوشنودی کے لئے ایسے ہی طریقے اختیار کرتے جو فریق ثانی کی دل شکنی کا باعث ہوتے مثلاً متھرا کے نواح میں ۱۶۶۱ء سے عبدالنبی نامی فوجدار متعین تھا۔ اس نے ایک مندر

سے ایک کندہ پتھر جو دارا نے بطور تحفہ دیا تھا نکلوا دیا یہ دیکھ کر اس ضلع کے جاٹوں نے گوکل نامی ایک شخص کی سرداری میں فساد برپا کیا اور عبدالنبی فوجدار کو قتل کر دیا۔ اورنگ زیب نے فوراً اعلیٰ افسروں کی کمان میں فوج بھیجی اور بہت جلد اس فتنہ کو دبا دیا۔

ایسا ہی دوسرا واقعہ ستنامیوں کی شورش کا ہے جس میں آپس کے جھگڑے کو مذہبی رنگ دے کر تعصب کی آگ کو ہوا دی گئی۔ واقعہ یہ ہے کہ ۱۶۷۲ء میں میوات کے علاقہ میں ایک ستنامی فرقہ کے کسان کے کھیت کی خبر گیری ایک مسلمان سپاہی رکھتا تھا کسی بات میں ان دونوں میں نزاع ہوا سپاہی نے اس ستنامی کسان کا سر پھوڑ دیا۔ اس بات پر اس فرقہ کے کچھ لوگوں نے سپاہی کی اتنی زدوکوب کی کہ وہ مرنے کے قریب ہوگیا جب شحنہ دار نے گنہ گار کو گرفتار کرنے کی کوشش کی تو اس بات پر فرقہ کے تمام ستنامیوں نے بلوہ کر دیا۔ اورنگ زیب کو جب اس واقعہ کی اطلاع ملی تو اس نے فساد کو فرو کرنے کے لئے فوج بھیجی اور ستنامیوں کے ساتھ بڑی خون ریز جنگ ہوئی جس میں قریب دو ہزار ستنامی کام آئے۔

اس دور میں سکھوں نے بھی اپنی قوم کی بڑی تنظیم کی اور ایک مذہبی فرقہ کے بجائے سیاسی فرقہ میں اپنے آپ کو تبدیل کر دیا۔ سکھوں کی تنظیم کو بھی اورنگ زیب کے مذہبی خیالات کا ردعمل بتایا جاتا ہے مگر ان کی تاریخ سے یہ واضح ہے کہ عہد جہانگیر سے اس قوم کے پیشواؤں نے اپنی قوم کی تنظیم شروع کر دی تھی۔ اس کا بڑا سبب یہ بتایا جاتا ہے کہ جہانگیر نے ۱۶۰۶ء میں گرو ارجن کو اس جرم پر قتل کرا دیا تھا کہ گرو نے خسرو کو شہزادہ کی بغاوت کے زمانہ میں بادشاہ کے خلاف مدد دی تھی اس واقعہ کے بعد سے سکھوں

نے اپنے کو گرو گوبند کی پیشوائی میں منظم کرنا شروع کر دیا۔ اورنگ زیب کے زمانہ میں سکھ گرو تیغ بہادر نے اورنگ زیب کی مذہبی پالیسی کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی اور بات اتنی بڑھی کہ تیغ بہادر کو اپنی جان سے ہاتھ دھونے پڑے اس واقعہ کے بعد گرو گوبند سنگھ نے اپنی قوم کو جنگجو قوم بنانے کی طرف توجہ مبذول کی۔ اگرچہ عہد اورنگ زیب میں یہ اپنے ارادوں کو عملی جامہ پہنا نہ سکے مگر ان کے پیشواؤں نے فقر کو چھوڑ کر شاہی طریقہ معاشرت اختیار کیا۔ قلعے بنوانے لگے اور زمینداروں سے جنگیں کرتے رہتے۔ ایسی بعض سرکشیوں کے خلاف مغل فوجوں کو بھیجا گیا جن کے مقابلہ میں سکھوں کو شکست کا منھ دیکھنا پڑا۔ اورنگ زیب نے اپنے آخری زمانہ میں گرو گوبند سنگھ کو اعزاز کے ساتھ دربار میں آنے کی دعوت دی۔ گرو گوبند سنگھ اورنگ زیب کی دعوت پر دکن جانے کے لئے تیار ہوئے لیکن اسی اثنا میں اورنگ زیب کے انتقال کی خبر ملی تو گوبند سنگھ نے دکن جانے کا خیال ترک کر دیا۔

اورنگ زیب کے دور حکومت کے نصف اوّل میں راج پوتوں کی شورش بہت اہمیت رکھتی ہے اس کے آغاز کا سبب یہ ہوا کہ راجہ جسونت سنگھ جو درۂ خیبر میں جمرود کا فوجدار تھا انتقال کر گیا۔ چوں کہ راجہ کی اولاد نرینہ نہیں تھی اورنگ زیب نے ریاست جودھپور کو اپنی قلمرو میں شامل کر لینا چاہا۔ فوراً مسلمان فوجدار، قلعہ دار، امین کوتوال وغیرہ عہدے داروں کا ریاست میں تقرر کیا۔ اورنگ زیب کو بعد میں معلوم ہوا کہ راجہ جسونت سنگھ کی دو رانیوں کے بطن سے دو بچے پیدا ہوئے جن میں سے ایک مر گیا اور دوسرا اجیت سنگھ زندہ تھا۔ راجپوت سردار بچہ کو دہلی لے گئے اور جودھپور پر اس کا حق ثابت کرنے کی کوشش کی مگر اورنگ زیب نے اجیت سنگھ کو شاہی دربار

میں پرورش پانے کے بعد جودھ پور اس کے سپرد کرنے کا وعدہ کیا۔ جسونت سنگھ کے ایک نمک خوار درگا داس نے اس بات کو پسند نہیں کیا اور اجیت سنگھ کو مغلوں کے پنجہ سے بچا کر مارواڑ لے آیا۔ اورنگ زیب نے اس واقعہ کے بعد مارواڑ پر سربلند خان کی کمان میں ایک فوج بھیجی اور خود بھی اجمیر گیا راجپوتوں نے مغل فوجوں کا مقابلہ کیا لیکن ہزیمت اُٹھائی اور اس طرح مارواڑ مغل قلمرو میں شامل کر دیا گیا۔ یہ صورت حال دیکھ کر میواڑ کے رانا اور دوسرے راجپوت سرداروں نے اجیت سنگھ کے حق کے لئے لڑنے کا تہیہ کر لیا۔ اورنگ زیب نے میواڑ کو فتح کرنے کے لئے تجربہ کار افسروں کو روانہ کیا اور خود بھی اجمیر سے آگے بڑھا مغلوں نے پہلے تو بہت جلد پورے میواڑ پر قبضہ کر لیا مگر راجپوت ابھی ہمت نہیں ہارے تھے اور اورنگ زیب کے اجمیر لوٹ آنے کے بعد پیہم حملے کر رہے تھے۔ راجپوت کو دبانے میں مغلوں کو کوئی خاص کامیابی نہیں ہو رہی تھی۔ اس لئے اورنگ زیب نے فوراً شہزادہ اکبر کو میواڑ سے مارواڑ بھیج دیا اور شہزادہ معظم کو اس کی جگہ پر متعین کیا۔ مارواڑ میں مقام چھیلواڑہ پر راجپوتوں سے ایک جنگ ہوئی جس میں شاہی لشکر فتح مند رہا مگر اسی کے بعد اکبر راجپوتوں سے مل گیا اور ۱۶۸۱ء میں اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا اور فوج لے کر اجمیر کی طرف بڑھا اس موقع پر اورنگ زیب نے اپنے سیاسی تدبر سے کام لیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ راجپوت اکبر کا ساتھ چھوڑ کر بھاگ گئے اکبر کو بھی اس صورت میں واپس راجپوتانہ جانا پڑا۔ میواڑ کا رانا ہمت ہار گیا اور مغلوں سے صلح کر لی مگر مارواڑ میں درگا داس اس کے بعد تیس سال تک اجیت سنگھ کے حق کے لئے لڑتا رہا۔ اکبر درگا داس کے ساتھ تھا مگر جب راجپوتوں نے دیکھا کہ اکبر کا مارواڑ میں رہنا دشوار ہے تو اسے دکن سنبھو جی کے پاس پہنچا دیا۔ آخر بہادر شاہ نے اپنے عہد حکومت میں

جودھ پور پر اجیت سنگھ کے حق کو مان لیا۔

دکن :۔ اورنگ زیب نے اپنی حکومت کے پچیس سال دکن کے میدان جنگ میں گذارے اور آخر اسی جگہ اس دور کا خاتمہ بھی ہوا۔ اورنگ زیب کو دکن میں تین حریفوں کا مقابلہ کرنا پڑا یہی وہ دور ہے جب کہ شیواجی نے مرہٹہ قوم کی صرف تنظیم ہی نہیں کی بلکہ ایک مرہٹہ حکومت کی بنیاد ڈالی۔ اگرچہ دکن کی مسلم سلطنتیں کافی کمزور ہو چکی تھیں تاہم اورنگ زیب کو انھیں مسخر کرنے میں بڑی مشکلات پیش آئیں

۱۶۵۸ء سے ۱۶۸۲ء یعنی اورنگ زیب کے راجپوتانہ کی مہم سے فارغ ہو کر دکن آنے تک دکن کے پانچ صوبہ دار گذرے جن میں شہزادہ شاہ عالم گیارہ سال، بہادر خان چھ سال، شائستہ خاں چار سال، جے سنگھ دو سال، دلیر خاں ایک سال صوبہ دار کے عہدہ پر فائز رہے ان صوبہ داروں کے زمانہ میں دکن میں میدان کارزار ہر وقت گرم رہا۔ مرہٹے نہ خود چین سے بیٹھے نہ مغلوں کو چین لینے دیا۔ آخر شہزادہ اکبر کی بغاوت اور اس کے دکن جانے نے اورنگ زیب کو تشویش میں ڈال دیا اور یہ راجپوتانہ کی مہم سر کرنے کے بعد ۱۶۸۲ء میں دکن پہنچ گیا۔

۱۶۶۶ء میں محمد عادل شاہ کے انتقال پر اورنگ زیب نے بیجاپور پر دست تصرف بڑھایا۔ اس کے خلاف شیواجی نے مغلوں کا ساتھ دیا مگر بہت جلد مغلوں سے الگ ہو کر دکن کے مختلف حصوں میں لوٹ مار شروع کر دی۔ ستمبر ۱۶۵۷ء میں بیجاپور نے مغلوں سے صلح کر لی۔ شیواجی نے بھی مجبوراً صلح کے لئے ہاتھ بڑھایا چوں کہ جنوری ۱۶۵۸ء میں شاہجہاں کی علالت کی وجہ سے اورنگ زیب شمالی ہند کو لوٹ رہا تھا اس لئے شیواجی کی درخواست کو بھی قبول کر لیا۔

شیواجی موقع کا منتظر ہی تھا اورنگ زیب کے دکن چھوڑنے کے بعد فوراً تاخت و تاراج اور قبض و تصرف کا کام شروع کر دیا۔ اس نے سب سے پہلے کلیان اور بھیونڈی پر قبضہ کیا اور اس کے بعد پے در پے ملک کے مختلف قلعے فتح کرتا چلا گیا۔ ۱۶۵۹ء تک اس نے اتنا علاقہ فتح کر لیا تھا کہ تقریباً چالیس قلعے شیواجی کے مقبوضات میں تھے۔ بیجاپور کے سلطان کو ہمیشہ شیواجی کا اندیشہ رہا اور اس لئے سلطان اورنگ زیب سے صلح کے بعد شیواجی کی سرکوبی کی طرف متوجہ ہوا لیکن اس کوشش میں بیجاپور کو افضل خاں ایسے سردار سے ہاتھ دھونا پڑا۔

شہزادوں کی جنگ ختم ہونے کے بعد اورنگ زیب نے زمام حکومت اپنے ہاتھ میں لی اور شیواجی کے حوصلوں کو پسپا کرنے کے لئے جولائی ۱۶۵۹ء میں شائستہ خاں کو دکن کا صوبہ دار مقرر کیا۔ شائستہ خاں نے دکن آتے ہی شیواجی کے مقبوضہ قلعے فتح کرنا شروع کیا اور پنہالہ، چکن، پونا وغیرہ بہت قلیل عرصہ میں سر کر لئے۔ ۱۶۶۱ء میں شائستہ خاں کونکن کی طرف متوجہ ہوا اور اس علاقہ کا بھی تھوڑا بہت حصہ فتح کر لیا۔ ۱۶۶۳ء میں ایک رات مرہٹوں نے شائستہ خاں پر شبخون مارا اور مغل فوج کو کافی نقصان پہنچایا۔ اورنگ زیب نے اس سانحہ کے بعد شائستہ خاں کی جگہ پر شہزادہ معظم کو بھیجا۔

۱۶۶۴ء میں شیواجی نے سورت کو لوٹا تو اورنگ زیب نے راجہ جے سنگھ کو دکن بھیجا۔ راجہ نے آتے ہی اپنے فوجی اور سیاسی تجربہ سے کام لیا۔ مغلوں نے جب پرندھر، وجرگڈھ وغیرہ فتح کر لئے تو شیواجی ہمت ہارنے لگا اور صلح کی درخواست کی۔ راجہ جے سنگھ نے فوراً درخواست منظور کر لی اور پرندھر میں معاہدہ کیا اس معاہدہ

کی رو سے مغلوں کو تقریباً ۲۳ قلعے ہاتھ لگے۔ اسی موقع پر راجہ نے شیواجی کو آگرہ جانے پر بھی آمادہ کر لیا تاکہ مغلوں کے ایک بڑے دشمن کا قلع قمع ہو جائے لیکن شیواجی اورنگ زیب کے سلوک سے خوش نہ ہوا اور ۱۶۶۷ء میں بھاگ کر دکن واپس آگیا۔ دکن آنے کے بعد تین سال تک خاموشی سے تیاری کرتا رہا۔

۱۶۵۷ء میں اورنگ زیب اور بیجاپور کے درمیان معاہدہ ہوا تھا لیکن چونکہ سلطان نے اس پر عمل نہیں کیا اس لئے ۱۶۶۵ء میں راجہ جے سنگھ نے بیجاپور کے خلاف جنگ شروع کی۔ یہ جنگ کئی مہینوں جاری رہی مگر مغلوں کو اس سے کوئی فائدہ نہ ہوا اور اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ عادل شاہ ثانی نے ۱۶۶۱ء سے ۱۶۶۶ء تک اپنی غیر معمولی سیاسی اور فوجی لیاقت سے کام لیا لیکن اس کے بعد یہ عیش و عشرت میں پڑ گیا اسی وقت سے اس سلطنت کا زوال شروع ہو گیا ۱۶۷۲ء میں سلطان کے انتقال پر اس کے چار سالہ بیٹے سکندر عادل شاہ کو تخت پر بٹھایا گیا اس زمانہ میں حکومت کا نظم و نسق وزیروں کے ہاتھ میں تھا آپس میں خانہ جنگیاں شروع ہو گئیں مغلوں نے ان خانہ جنگیوں اور ملکی اور غیر ملکی کے سوال سے بہت فائدہ اٹھایا۔ شہزادہ معظم کی جگہ پر بہادر خان کو دکن بھیجا گیا۔ بہادر خان نے آنے کے بعد بیجاپور پر حملہ کر دیا مگر وزیر خواص خاں نے صلح کر لی یہ صلح عارضی تھی ۱۶۷۷ء میں بہادر خاں نے دوبارہ جنگ چھیڑ دی اور نل درگ اور گلبرگہ پر قابض ہو گیا۔ بیجاپور نے اس وقت بھی مغلوں سے معاہدہ کیا مگر گلبرگہ کے معاہدہ پر عمل نہ ہونے کی وجہ سے ۱۶۷۹ء میں بہادر خان نے پھر بیجاپور پر حملہ کیا۔ مگر اس میں کامیابی نہ ہوئی اس ناکامی کا بڑا سبب یہ ہے کہ مغل سرداروں میں اختلاف رائے اور ذاتیات کی وجہ سے اتحاد عمل قائم نہیں رہا تھا۔

سنہ ۱۶۷۷ء میں مغلوں نے گولکنڈہ کی طرف رُخ کیا شیواجی کی امداد کرنے کے جرم پر گولکنڈہ سے مغلوں نے ایک کروڑ روپیہ اور دس ہزار گھوڑے بطور جرمانہ طلب کئے۔ جب سلطان نے ادائگی سے انکار کیا تو مغلوں نے جنگ کا اعلان کیا۔ مقام مال کھیڑ پر دونوں کے درمیان جنگ ہوئی مگر دلیر خان نے بہت جلد گولکنڈہ سے صلح کرلی۔

تین سال کی تیاری کے بعد شیواجی نے پھر لوٹ مار شروع کردی سنہ ۱۶۷۰ء میں دوبارہ سورت کو لوٹا اور اسی سال کے دسمبر میں برار، خاندیش، برہان پور وغیرہ کو تاراج کیا سنہ ۱۶۷۲ء میں سورت کے تاجروں اور متصدی سے پھر چار لاکھ روپیہ طلب کیا اسی سال عادل شاہ ثانی کے انتقال کے بعد شیواجی نے کناڈا کے علاقہ کو لوٹا سنہ ۱۶۷۴ء میں دلیر خان نے ادھر کونکن میں مرہٹوں کے مقبوضات پر حملے شروع کئے مگر شیواجی نے مغلوں کو کامیاب نہ ہونے دیا سنہ ۱۶۷۶ء میں شیواجی نے کرناٹک کا بھی تھوڑا سا حصہ فتح کرلیا تھا سنہ ۱۶۸۰ء میں شیواجی مرگیا غرض اس وقت تک شیواجی نے دکن و گجرات کو تباہ کردیا تھا جس سے جان و مال کا بے انتہا نقصان ہوا شیواجی کے بعد اس کا بیٹا شمبھوجی تخت و تاج کا مالک ہوا شمبھوجی نے پہلے اپنے مقبوضات کی حفاظت کا انتظام کیا اور اس کے بعد مغلوں سے جنگ چھیڑی اور لوٹ مار کا سلسلہ شروع کیا سنہ ۱۶۸۱ء میں مرہٹوں نے برہان پور اور بہادر پور (برہان پور سے تین میل کے فاصلہ پر) کو لوٹا۔

سنہ ۱۶۸۱ء میں شہزادہ اکبر دکن چلا آیا۔ اورنگ زیب بھی راجپوتانہ سے اپنے تجربہ کار سرداروں کو لے کر مارچ سنہ ۱۶۸۲ء میں دکن پہنچ گیا۔

اورنگ زیب نے اورنگ آباد میں مقام کیا اور سب سے پہلے مغل

قلمرو کی سرحدوں پر مضبوط پہرے بٹھلا دے تاکہ شہزادہ اکبر اپنے ارادوں میں کامیاب نہ ہو سکے۔ اورنگ زیب نے دکن کے مختلف حصّوں پر اعلیٰ افسروں کی کمان میں فوجیں روانہ کیں حسن علی کو کونکن بھیجا اس نے آسانی سے کلیان پر قبضہ کر لیا۔ خان جہاں کو حکم ہوا کہ وہ بہادر گڑھ کو صدر مقام بنائے اور مرہٹوں پر حملے کرے۔ شہزادہ اعظم اور دلیر خاں کو جنوب میں احمد نگر کی طرف روانہ کیا۔ اور شہاب الدین اور دلپت راؤ کو مغربی سرحد ناسک روانہ کیا۔ اورنگ زیب نے اس طرح مرہٹوں پر کافی دھاک بٹھادی اور مرہٹوں کی لوٹ مار اور قبض و تصرف کے طوفان کو بڑی حد تک قابو سے باہر نہ ہونے دیا۔

چوں کہ اورنگ زیب اب مرہٹوں کے خلاف بڑے پیمانے پر جنگ کا آغاز کرنا چاہتا تھا اس نے ۱۶۸۳ء میں اپنی تمام بکھری ہوئی فوجوں کو واپس بلا لیا ادھر شمبھو جی مغلوں کی طرف سے ذرا مطمئن ہوا تو اس نے پرتگیزوں کے مقبوضات پر حملے شروع کئے جنگوں کا سلسلہ قریب دس مہینے رہا اور اس دوران میں دمن سے سیبن تک کے کئی مقامات پر مرہٹوں نے قبضہ کر لیا تھا لیکن شہزادہ معظم نے جیسے ہی کونکن پر حملہ کیا تو شمبھو جی نے پرتگیزوں سے صلح کر لی مگر یہ صلح قلیل مدت رہی معظم کی فوج کو کونکن میں قحط اور وبا سے بڑا نقصان پہنچا تو شمبھو جی نے مغلوں کی طرف سے مطمئن ہو کر دوبارہ پرتگیزوں سے جنگ چھیڑ دی مگر اس کے بعد صلح ہو گئی۔

۱۶۸۳ء میں اورنگ زیب احمد نگر آیا اور پھر مختلف سرداروں کی کمان میں فوجیں روانہ کیں ۱۶۸۴ء کے اوائل میں مغل فوجیں فتح مند رہیں اسی زمانہ میں

شمبھوجی کے خاندان کے افراد کو بہادر گڑھ سے قید کر لیا۔ ۱۶۸۵ء کے وسط تک مغل مرہٹوں کے بے شمار مقبوضات پر قابض ہو گئے۔

اپریل ۱۶۸۵ء میں بیجاپور کے محاصرہ کا آغاز کیا گیا۔ خود اورنگ زیب احمد نگر سے شولاپور پہنچ گیا تھا تاکہ نگرانی کر سکے۔ ادھر گولکنڈہ پر بھی پہرہ بٹھا دیا تاکہ بیجاپور کو اس طرف سے مدد نہ پہنچ سکے۔ اس محاصرہ کے ابتدائی مہینوں میں قحط اور وبا سے مغلوں کو بڑا نقصان پہنچا۔ اٹھارہ مہینے بیجاپوریوں نے مقابلہ کیا آخر سلطان نے ہتھیار ڈال دئے اور ۱۶۸۶ء میں ۱۲ ستمبر کو قلعہ مغلوں کے حوالے کر دیا۔ سکندر عادل شاہ کو قید کر دیا گیا۔ ایک ہفتہ کے بعد اورنگ زیب شہر میں داخل ہوا اور جامع مسجد میں نماز جمعہ ادا کی۔

گولکنڈہ کا نظام حکومت بھی اس وقت تک درہم برہم ہو چکا تھا۔ ابوالحسن داد عیش دے رہا تھا اور زمام حکومت دو برہمن بھائی اکنا اور مدنا کے ہاتھ میں تھی۔ مدنا ۱۲ سال خود مختار وزیر رہا۔ اور اس دوران میں بدنظمی پھیلی ہوئی تھی اور یہ ظلم و استبداد کا دور تھا۔ اورنگ زیب بیجاپور سے فارغ ہو کر گولکنڈہ کی طرف متوجہ ہوا۔ سات ماہ کے سخت محاصرہ کے بعد ستمبر ۱۶۸۷ء میں مغل فتح مند ہوئے اور دکن کی یہ ریاست بھی مغل قلمرو میں شامل کر دی گئی۔ ابوالحسن کو بھی دولت آباد کے قلعہ میں قید کر دیا گیا۔

بیجاپور اور گولکنڈہ سے فراغت پا کر اورنگ زیب پھر مرہٹوں کی طرف متوجہ ہوا۔ شمبھوجی کو جب مغلوں کے حملوں کی خبر ہوئی تو یہ سنگ مشور چلا گیا مگر مقرب خان نے سنگ مشور پر اچانک حملہ کر دیا اور شمبھوجی کو قید کر لیا۔ شمبھوجی کا چھوٹا بھائی راجہ رام

یہاں سے بھاگ نکلا تھا مرہٹوں نے اسے تخت پر بٹھلایا اور مغلوں کے خلاف جنگ جاری رکھی مغلوں نے جنجی کے قلعہ کا محاصرہ کیا اور ۱۶۹۸ء میں یہ قلعہ فتح کرلیا۔ راجہ رام یہاں سے بھاگ کر ستارا گیا۔ مغلوں نے فوراً ستارہ کا محاصرہ کیا۔ ۱۷۰۰ء میں راجہ رام مرگیا اور مرہٹوں کے منصوبے خاک میں مل گئے۔ راجہ رام کے بعد مرہٹوں نے مغلوں سے صلح کرلی۔ ۱۷۰۶ء میں اورنگ زیب بیمار پڑا اور احمد نگر گیا۔ جہاں مرض الموت نے اس پیکر عمل کو ہمیشہ کے لئے چین کی نیند سُلا دیا۔

بدنظمی :- اگرچہ اورنگ زیب اپنے ملک کے گوشہ گوشہ سے ہر وقت باخبر رہتا تھا اور ہر علاقہ کے نظم و نسق کو درست رکھنے کی اس نے ہر ممکن کوشش کی لیکن چوں کہ اورنگ زیب نے جنگ و جدل سے آخری دم تک فرصت نہ پائی اس لئے اس قدر وسیع مملکت کے نظام کو تخریب سے بچانے میں زیادہ کامیاب نہ ہوا اعلیٰ افسر اور شاہی ملازمین اپنے علاقوں میں بہت خود مختاری سے کام لیتے تھے۔ اورنگ زیب کے مصروف جنگ ہونے کی وجہ سے انہیں بازپرس کا خوف کم تھا رعایا پر ان کا ظلم و استبداد حد سے گذر چکا تھا ملک کی اقتصادی حالت خراب ہونے کی وجہ سے ملازمین کو مہینوں تنخواہیں نہیں ادا کی جاتیں اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ رشوت اور حصول زر کے ناجائز طریقے عام ہوتے گئے۔

زراعت :- ملک کا دار و مدار زراعت اور تجارت پر تھا مگر اس دور میں زراعت کی حالت ابتر تھی خصوصاً دکن کی پچیس سالہ جنگ نے دکن اور گجرات کی زراعت کو تباہ و برباد کر دیا تھا۔ فوجوں کی نقل و حرکت اور ان کی ضروریات نیز سپاہیوں کی بے احتیاطی نے سبزہ زاروں کی جگہ ویران بنجر زمین کا منظر پیش کر دیا

تھا۔ اس صورت حال کو دیکھ کر کسان بھی بے دلی سے کاشتکاری کرتا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ غلّہ گراں ہوتا گیا مزید برآں آفات سماوی و ارضی نے بھی زراعت کو نقصان پہنچایا اگرچہ ملک کے دوسرے علاقوں میں غلّہ کی فراوانی تھی مگر چوری ڈاکہ کے خطروں سے غلّہ کی نقل و حرکت مسدود تھی۔ کسان اس دور میں ایک تو ان آفات کا شکار رہا اور دوسری طرف زمینداروں کے ظلم و ستم نے اس کی مصیبتوں میں اضافہ کر دیا تھا۔

سیاسی بدامنی کے باوجود تجارت کو زیادہ نقصان نہیں ہوا۔ بلکہ انگریزوں نے اسی عہد میں ملک کے مختلف حصّوں میں اپنی تجارتی کوٹھیاں قائم کیں۔ شیواجی کی لوٹ کھسوٹ سے کچھ مدّت کے لئے تجارت کی منڈیاں سرد ہو جاتی تھیں لیکن سمندر پار کے ملکوں سے تجارت سے زیادہ نقصان نہ ہوا۔ اورنگ زیب کے آخری بیس سال میں بحری ڈاکوؤں کا زور بڑھ گیا تھا مگر اس کے باوجود تجارت میں فرق نہ آنے پایا۔

اقتصادی حالت :۔ سالہا سال کی جنگوں نے شاہی خزانوں میں خلا پیدا کر دیا تھا آمدنی کے ذرائع مسدود ہوتے جا رہے تھے۔ زراعت کو نقصان پہنچنے سے محصول کی رقم کم ہوتی گئی دشمنوں کے اعلیٰ افسروں کو رشوت دینے میں کافی خرچ ہوتا اورنگ زیب نے اپنے آبا اجداد کی جمع کی ہوئی دولت کا بھی بیشتر حصّہ ختم کر دیا تھا۔

ملک میں بیکاری اور بدنظمی کی وجہ سے بدمعاش عنصر نے چوری ڈاکہ کے طریقوں کو عام کر دیا تھا۔ راجپوتوں کا پیشہ سپاہ گری تھا مگر انہوں نے بھی ڈاکہ زنی کو اپنا پیشہ بنا لیا تھا۔ شہر اور دیہات کسی جگہ امن و سکون کا نام و نشان نہیں پایا جاتا تھا غرض اورنگ زیب کے انتقال کے وقت ملک بدحالی کا شکار تھا۔

اورنگ زیب کا عہد جس طرح سیاسی اعتبار سے بڑی اہمیت رکھتا ہے

اسی طرح مذہبی حیثیت سے بھی یہ ایک خاص اہمیت کا مالک ہے دینی امور میں اس کا مسلک اپنے جدّ بزرگوار اکبر کے مسلک سے بالکل مختلف تھا۔ اکبر کی وسیع المشربی اور کشادہ دلی کسی قسم کے امتیازات کو جو مذہب اور نسل کی بنا پر قائم ہوں روا نہ رکھتی تھی۔ اسلامی حکومت کے آغاز ہی سے ہندی و ایرانی تہذیب کے درمیان مفاہمت و مصالحت کے آثار نمایاں ہونے لگے تھے لیکن اکبر کا عہد وہ زریں دور ہے جب ان دو تہذیبوں میں ہم آہنگی پیدا کرنے کے لئے حکمراں طاقت نے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ ہندوستان جیسے وسیع ملک میں استحکام سلطنت کے لئے اکبر سماجی ہم آہنگی اور مختلف مذاہب کے درمیان اتحاد و مفاہمت کو بہت ضروری قرار دیتا تھا۔ وہ صلح کل کے نشہ میں اس درجہ سرشار تھا کہ اس کے بعض اقدامات کو راسخ العقیدہ مسلمانوں نے طبقۂ دین سے کلّی انحراف پر محمول کیا۔ مسلمانوں کے سخت ردّ عمل کے باوجود رواداری اور کشادہ دلی کی اس روش کو جس کی بنیاد اکبر نے ڈالی تھی۔ جہانگیر اور شاہجہاں کے لئے یکسر بدلنا پڑا مشکل تھا۔ اکبر کے زمانہ سے دو قوتیں ایک دوسرے کے ساتھ برسرپیکار نظر آتی ہیں۔ ایک قوت وسیع المشربی اور مذہبی قیود سے بے نیازی کی ہے اور دوسری قوت راسخ الاعتقادی کی جو وسیع المشربی اور صلح کل کے مسلک کو بے دینی اور بے اعتدالی تصور کرتی تھی۔ اکبر اور جہانگیر کے عہد میں راسخ العقیدہ مسلمانوں کے سب سے زبردست نمائندے حضرت مجدد الف ثانی تھے۔ جنھوں نے وحدت وجود کی بے اعتدالیوں کا خم ٹھوک کر مقابلہ کیا۔ مجدد صاحب اور ان کے جانشینوں کی مساعی نے اورنگ زیب کی صورت میں ظہور کیا۔ دوسری جانب جس غرض سے اکبر نے دین الٰہی کی بنیاد ڈالی تھی۔ مختلف مذاہب کے نمائندوں کے درمیان تبادلہ خیال کے لئے

عبادت خانہ تیار کرایا تھا تصوّف اور ہندو فلسفہ میں تطبیق پیدا کرنے کی کوشش کی تھی اس مقصد کے حصول کے لئے اسی کے خاندان سے ایک شہزادہ اٹھا جو وحدت وجود کے رنگ میں رنگا ہوا تھا۔ جو اسلام مجازی سے بیزار اور کفر حقیقی کا دلدادہ تھا۔ جو ایک طرف صوفیائے کرام اور خاص طور پر حضرت میاں میر قادری اور ان کے مرید ملّا شاہ بدخشی کا حلقہ بگوش تھا اور دوسری طرف اپنشد کو توحید کا سرچشمہ سمجھتا تھا اور وحدت ادیان کا دل سے قائل تھا۔ ایک طرف وہ سفینۃ الاولیاء، سکینۃ الاولیاء، اور حسنات العارفین لکھ کر صوفیا کے مقدّس گروہ کے ساتھ اپنی عقیدت اور وابستگی کا ثبوت دیتا ہے اور دوسری طرف اپنشد کے فارسی ترجمہ (سرّ اکبر) اور مجمع البحرین کی تالیف سے اپنی وسیع المشربی اور فراخ دلی کا اظہار کرتا ہے۔ دارا اور اورنگ زیب اپنے اپنے مسلک پر گامزن تھے۔ اورنگ زیب شریعت کا پابند تھا اور دارا طریقت کا سالک۔ دونوں کے مذہبی خیالات میں بعد المشرقین تھا۔ دور حاضر کے بعض مؤرخ اورنگ زیب و دارا کی باہمی جنگ کو عقیدہ و نظریہ کی کشمکش کا نتیجہ بتاتے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ اورنگ زیب کے خطوط میں دارا کی بے دینی و الحاد کا بار بار ذکر آیا ہے لیکن اسے اس بات پر کیوں نہ محمول کیا جائے کہ یہ الحاد و بے دینی کا الزام سیاسی حریف کو نیچا دکھانے کے لئے ایک موثر حربہ تھا۔ اورنگ زیب نے اپنے نظریہ کے مطابق اسلامی اصولوں پر حکومت چلانے کی کوشش کی۔ شریعت کے احکام رعایا کے لئے لازم و ملزوم قرار دئے لیکن تمام کاوش و کاہش کے باوجود اورنگ زیب حصول مطلب میں زیادہ کامیاب نہ ہوا۔ اس کے کئی اسباب تھے۔ ابھی شاہجہاں کے دور کی رنگ رلیاں لوگوں کو بھولی نہیں تھیں صوفیوں نے دوکانداری قائم کر رکھی تھی اور توکل و قناعت

کے غلط معنی سمجھا کر عوام کو بیوقوف بنا رکھا تھا شریعت کی جکڑبندیوں کے مقابلہ میں طریقت کو آزادی خیال کرنے آرام طلب طبیعتیں اس طرف مائل ہونے لگیں۔ لوگوں کے اس رجحان کی سب سے بڑی وجہ اس زمانہ میں علمائے دین کی تنگ نظری بھی مقدسین کے اس فرقہ نے اسلام کو ہوا بنا کر پیش کیا لہذا عوام نے ان سختیوں سے نجات پانے کے لئے تصوف میں پناہ لی۔ اس طرح اس دور میں الحاد و بے دینی کو تقویت مل گئی اور اس کا زور بڑھتا گیا۔ منجموں اور رمالوں کی قدر بڑھ گئی۔ لوگ تقدیر پر بھروسہ کرنے لگے، اور اس طرح عمل اور تدبیر کے دروازے مسدود ہوتے گئے۔ تصوف کا زور ہونے سے مرشد پرستی بڑھ گئی صرف مسلمان ہی اس فعل کے مرتکب نہیں بلکہ سکھوں اور ہندوؤں میں بھی یہ بدعت بدرجۂ اتم موجود تھی ہندوستانیوں میں توہم پرستی کا عام ہونا اس زمانہ میں عقل و شعور کے زوال کی سب سے بڑی دلیل ہے اگرچہ اورنگ زیب نے اخلاقی اصلاحات کی طرف سب سے زیادہ توجہ دی اور سیہ خدا ترس شراب، جوا اور بداخلاقی کی سختی سے روک تھام کرتا رہا مگر افسوس کہ اس کا ردعمل بہت برا ہوا۔ قحط سالی، جنگ و جدال اور اونچے طبقے کی بے پناہ عیاشی کی وجہ سے بردہ فروشی کا زور بڑھ گیا تھا۔

گجرات :۔ چوں کہ ولی کا گجرات سے گہرا تعلق ہے اور اس کی عمر کا بیشتر حصہ بھی گجرات میں بسر ہوا ہے اس لئے ضروری ہے کہ عہد اورنگ زیب میں گجرات کے سیاسی، سماجی اور علمی حالات کا جائزہ لیا جائے مرہٹوں کی تاخت و تاراج دکن تک ہی محدود نہ تھی بلکہ گجرات اپنے تمول اور دولت مندی کی وجہ سے ان قسمت آزماؤں کے لئے بہت بڑی کشش کا باعث تھا۔

سنہ ۱۰۶۷ھ میں گجرات کی صوبہ داری کے فرائض شہزادہ مراد بخش انجام دے

رہا تھا اس نے شاہجہاں کی علالت کا پتہ چلتے ہی اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا اور احمد آباد سے سورت اور سورت سے اجین کا رخ کیا۔ اس مفصل ذکر پہلے کیا جا چکا ہے راجہ جسونت سنگھ کو گجرات کا صوبہ دار تجویز کیا گیا۔ راجہ اپنا عہدہ سنبھالتے ہی نظم و نسق کی طرف متوجہ ہوا۔ رحمت خان دیوان صوبہ، محمد بیگ خان ترکمان وغیرہ جو دارا کے ساتھ چلے گئے تھے واپس آئے۔ راجہ نے اورنگ زیب سے ان کی سفارش کی۔ اورنگ زیب نے انہیں معاف کر دیا اور دوبارہ رحمت خان کو دیوان صوبہ مقرر کیا اور قطب الدین خان کو سورٹھ کا فوجدار بنا کر بھیجا سردار خاں کو جس نے دارا کو دوسری بار گجرات میں پناہ نہیں دی خلعت فاخرہ کے ساتھ بھروچ کی فوجداری عنایت کی گئی ۱۶۶۱ء میں راجہ جسونت سنگھ کو شیواجی کی سرکوبی کے لئے دکن بھیجا گیا اور مہابت خاں کو گجرات کا صوبہ دار مقرر کیا گیا اور کرمت خان و حاجی شفیع خان کو دیوان صوبہ بنایا گیا۔

کاٹھیاواڑ میں ابتدائی دور میں زمینداروں کی شورشوں نے بدامنی پھیلا رکھی تھی۔ ۱۶۶۲ء میں نوانگر کے جام رن مل سنگھ کے انتقال پر اس کے بیٹے چھتر سال کو نامزد کیا گیا مگر چھتر سال کے چچا رائے سنگھ نے اس کی مخالفت کی اور اسے قید کر دیا۔ چھتر سال نے مغلوں سے مدد کی درخواست کی تو قطب الدین فوجدار سورٹھ نے اپنے بیٹے محمد خان کو چھتر سال کی مدد کے لئے بھیجا۔ اس جنگ میں رائے سنگھ نے زک اٹھائی۔ مغلوں نے دوبارہ چھتر سال کو اس کی جاگیر سپرد کی اور نوانگر کو اسلام نگر کا نام دیا۔ اس واقعہ کے بعد بھی رائے سنگھ کے بیٹے تیماجی اور نوانگر کے زمیندار بخت جی نے بھی کچھ مدت تک بدامنی پھیلا رکھی تھی۔

شیواجی کی حوصلہ مند طبیعت سورت کی بے انتہا دولت اور سیم و زر کو حاصل کرنے کے لئے عرصہ سے مچل رہی تھی آخر موقع پاتے ہی ۱۶۶۴ء میں شیواجی نے سورت

پر پہلا حملہ کر دیا اور کئی دن تک شہر کو دل کھول کر لوٹا۔ اس سلسلہ میں اہل سورت پر اُس نے جو ستم ڈھائے وہ بیان سے باہر ہیں تین روز تک شہر میں خون کی ندیاں بہتی رہیں اور آگ کے شعلے آسمان تک پہنچتے رہے جب مہابت خاں کو اس کی اطلاع پہنچی تو یہ علاقہ کے فوجداروں اور زمینداروں کی فوجوں کے ساتھ سورت کی طرف بڑھا مگر اس وقت تک شیواجی سورت سے کئی لاکھ روپیہ لے کر جا چکا تھا۔

۱۶۶۵ء میں گجرات کے متصدیوں کے نام ایک فرمان صادر ہوا جس کی رو سے بہت سے ابواب (ٹیکس) معاف کر دیئے گئے اسی فرمان سے مذہب سے متعلق ہندو اور مسلمانوں کے بارے میں اورنگ زیب کے طرز عمل پر روشنی پڑتی ہے ۱۶۶۶ء میں مہابت خاں کی جگہ پر الہ آباد کے صوبہ دار بہادر خاں خان جہاں کو بھیجا گیا اور حاجی شفیع خاں کی جگہ پر محمد ہاشم دیوان مقرر ہوا۔ خاں جہاں احمد آباد میں بہت قلیل مدت رہا اس نے احمد آباد میں ایک مسجد اپنی یادگار چھوڑی ہے جو گایکواڑ کی حویلی محلہ رائے کھڑ میں واقع ہے اور دریاپور کے دروازہ کے قریب اپنے نام محمد پناہ کی نسبت سے محلہ پناپور آباد کیا تھا۔ اس نے اپنے عہد صوبہ داری میں کئی اور عمارتیں بھی تعمیر کرائی تھیں ۱۶۶۷ء میں خان جہاں کو دکن بھیجا گیا اسی سال راجہ جسونت سنگھ کو دوبارہ گجرات کی صوبہ داری تفویض ہوئی اس زمانہ میں شیواجی نے دوبارہ گجرات میں لوٹ مار کی۔

۱۶۷۲ء میں راجہ جسونت سنگھ کو گجرات سے بلا لیا گیا اور اس کی جگہ پر میر جملہ کے بیٹے محمد امین کا تقرر کیا گیا اس دور میں گجرات کو چند آفات سماوی سے دوچار ہونا پڑا تھا اسی زمانے میں اودے پور کے رانا کے چھوٹے بیٹے بھیم سنگھ نے گجرات کے دو بڑے متمول شہروں ولسیل نگر اور وڈنگر کو لوٹا اور تاراج کیا اور رائیدر کے راجہ کی شرکت سے گجرات میں شورش

برپا کردی۔ اس فتنہ کے فرو کرنے کے لئے محمد امین نے محمد بہلول شیروانی کو بھیجا! ایڈر کے راجہ نے اپنے قلعہ میں پناہ لی مگر محمد بہلول نے قلعہ پر حملہ کر کے راجپوتوں کو شکست دی اور انہیں تتر بتر کر دیا ۱۶۷۴ء اور ۱۶۷۵ء میں شیواجی کے پیہم حملوں سے گجرات میں پھر بدامنی پھیل گئی اور تجارت کو بہت نقصان ہوا ۱۶۸۴ء میں محمد امین نے احمد آباد میں انتقال کیا اس کا مزار بھدر کے قلعہ میں ہے۔ اورنگ زیب محمد امین کا بڑا مداح تھا۔

محمد امین کے انتقال کے بعد مالوہ کے صوبہ دار مختار خاں کو گجرات بھیجا گیا اور سورٹھ شہزادہ محمد اعظم کو تفویض کیا گیا اسی اثنار میں مختار خاں نے وفات پائی تو گجرات کی صوبہ داری بھی محمد اعظم کو دی گئی ۱۶۸۴ء میں کارطلب خاں بعدہٗ شجاعت خاں کو سورت سے طلب کر کے نائب صوبہ دار مقرر کیا گیا سورت کی متصدی گری صلابت خاں کو عنایت ہوئی۔

شجاعت خاں گجرات کا بہت مقبول صوبہ دار گزرا ہے ۱۶۸۵ء سے ۱۷۰۱ء تک یعنی ۱۶ سال شجاعت خاں نے گجرات میں بہت ہی خوش اسلوبی سے اپنے فرائض انجام دئے اس کو جودھپور کا فوجدار بھی مقرر کیا گیا تھا تاکہ درگا داس راٹھور کے مقابلہ میں اس سے مدد ملتی رہے یہ چھ ماہ گجرات میں رہتا اور چھ ماہ مارواڑ میں قیام کرتا۔ متیوں اور مومنوں کی شورش اسی دور میں برپا ہوئی تھی۔ اس شورش کا حال آگے تفصیل سے بیان کیا جائے گا۔

اس ہر دلعزیز حاکم نے ۱۶۸۵ء میں بمقام احمد آباد انتقال کیا۔ اورنگ زیب کو اس کے انتقال سے بہت ملال ہوا۔ شجاعت خاں کی خدمات جلیلہ کے صلہ میں اس کی جائداد قانون کے مطابق ضبط نہیں کی گئی اور یہ رعایت دی گئی کہ اس کے ورثہ

میں تقسیم کردی جائے۔ اس کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ ہندو عورتیں اپنے گیتوں میں اس کے نظم و نسق کی تعریفیں کرکے خراج تحسین پیش کرتیں۔ احمد آباد میں اس نے ۱۶۹۵ء میں ایک عالی شان مسجد و مدرسہ تعمیر کرایا تھا جو اب تک موجود ہے اسی کے پہلو میں اس کو سپرد خاک کیا گیا ہے۔

شجاعت خان کے بعد شہزادہ محمد اعظم کو گجرات اور مارواڑ بہ ضمیمہ اجمیر کی صوبہ داری تفویض کی گئی اور خواجہ عبدالحمید خاں کو نائب صوبہ دار تجویز کیا گیا اسی سال شہزادہ محمد اعظم نے احمد آباد پہنچ کر گجرات کا نظم و نسق سنبھالا شیواجی نے اپنی زندگی میں گجرات کو امن سے نہ رہنے دیا مگر اس کے بعد بھی مرہٹوں کے حوصلے اتنے بڑھ گئے تھے کہ اکثر گجرات میں پھیل جاتے اور لوٹ مار مچاتے تھے ۱۷۰۲ء/۱۱۰۱ھ میں قریب بارہ ہزار مرہٹے نندبار اور اطراف میں پھیل گئے اور سورت اور برہان پور سے کافی دولت لے گئے ۱۷۰۵ء میں مرہٹہ دھناجا دھو قریب اسی ہزار فوج کے ساتھ گجرات پر حملہ آور ہوا۔ عبدالحمید خاں نے پہلے گجرات کے مختلف خطوں کے فوجداروں اور صفدر خاں بابی اور نظر علی خاں جیسے اعلیٰ افسروں کو اس کے مقابلہ کے لئے بھیجا لیکن ڈیڑھ ماہ تک مغل فوجیں نربدا کے کنارے داد عیش دیتی رہیں اور جنگ و قوع میں نہ آئی۔ مرہٹوں نے بڑودہ کے قریب بابا پیادہ کے قریب ڈیرے تنبو ڈالے آخر جنگ ہوئی اور نظر علی خاں سے معاہدہ کیا مگر جیسے ہی عبدالحمید خاں احمد آباد سے لشکر لے کر نربدا تک پہنچا تو مرہٹوں کو تشویش ہوئی اور دوبارہ زوروں کی لڑائی ہوئی۔ اس لڑائی میں بہت سے افسر کام آئے اور نظر علی اور عبدالحمید خاں مرہٹوں کے ہاتھ قید ہوئے ان دونوں کے لئے مرہٹوں نے بہت بڑی رقمیں مقرر کی تھیں۔ عبدالحمید خاں نے تھوڑی رقم ادا کی اور بقیہ رقم کے لئے اپنے برادر زادہ اور ہمشیر زادہ کو ضمانت پر مرہٹوں کے سپرد کیا اور خود

بقیہ رقم کا انتظام کرنے کے لئے احمد آباد آیا۔ اتفاق سے مرہٹوں میں کسی بات پر آپس میں مناقشہ ہوا تو یہ دونوں موقع پاتے ہی وہاں سے بھاگ نکلے مرہٹے بھی سورت اور نواح سورت کو ویران کرتے ہوئے دکن کی طرف لوٹ گئے۔

شہزادہ محمد اعظم گجرات کی آب و ہوا موافق نہ آنے کی وجہ سے برہان پور چلا گیا۔ اس کی جگہ پر کشمیر کے صوبہ دار ابراہیم خاں کا تقرر کیا گیا ابراہیم خاں کے دور میں بالاجی بشونا تھ گجرات پر حملہ آور ہوا۔ گذشتہ وقت دھنا جادھو کے حملہ کے بعد سے مرہٹوں کے حوصلے اتنے بلند ہو گئے تھے کہ احمد آباد سے چار میل کے فاصلہ پر قریب ہٹوہ کے ان کی فوجوں نے ڈیرے تنبو ڈالے مغل فوجوں نے بھی شہر پناہ کے قریب کانکریا تالاب پر مقام کیا عبدالحمید خاں اور نظر علی خاں جیسے نبرد آزما بھی مرہٹوں سے مقابلہ کرنے میں پس و پیش کر رہے تھے۔ اس وقت اورنگ زیب کا انتقال ہو چکا تھا اور تخت و تاج کا مالک کون شہزادہ ہو گا یہ معلوم نہ تھا ان وجوہ کی بنا پر ابراہیم خاں سے افسران اعلیٰ نے مشورہ کیا اور بالاجی بشونا تھ کے پاس صلح کے لئے وفد بھیجا۔ آخر کار دو لاکھ کھنڈنی دے کر بالاجی کو گجرات سے واپس لوٹایا مرہٹوں نے اطراف و اکناف میں اتنا خوف و ہراس پھیلا رکھا تھا کہ دیہاتیوں نے شہر احمد آباد میں پناہ لی تھی۔ ابراہیم خاں کے دور میں دوسرا واقعہ کڑی مقام کے کولیوں کی شورش کا پیش آیا لیکن اسے بہت جلد دبا دیا گیا ابراہیم خاں کے مستعفی ہونے کے بعد گجرات کی صوبہ داری غازی الدین فیروز جنگ کو تفویض کی گئی۔ غازی الدین ۱۷۰۸ء میں احمد آباد آیا اور نظم و نسق سنبھالا۔

اورنگ زیب کے بعد دہلی کے تخت پر کوئی ایسا سخت گیر سیاست داں اور مدبر حکمراں نہ آیا جو ایسی وسیع سلطنت کو سنبھال سکتا اور اپنی ذمہ داریوں کو اپنی لیاقت سے انجام دیتا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اورنگ زیب کی آنکھیں بند ہوتے ہی سرکشوں کے حوصلے بڑھ گئے جنھوں

نے پورے ملک میں بدامنی اور بدنظمی کا دور قائم کر دیا۔

اورنگ زیب کے مذہبی خیالات آپ دیکھ چکے ہیں۔ اپنے طرزِ عمل کا ثبوت یہ گجرات کی صوبہ داری کے دور میں بھی دے چکا ہے ۱۶۴۵ء میں احمد آباد کا ایک عالیشان جین مندر چنتامنی کسی خاص وجہ سے اورنگ زیب کے حکم سے بند کر دیا گیا اور اس کی جگہ پر ایک مسجد قوت الاسلام تعمیر کرائی جانے لگی جب اس واقعہ کی اطلاع شاہجہاں کو ملی تو ۱۶۴۸ء میں یہ مندر جینیوں کو اس شرط پر لوٹایا گیا کہ جس حصہ پر مسجد تعمیر ہو چکی ہے اسے چھوڑ کر بقیہ حصہ کو مندر کے کام میں لیا جائے۔ اسی مندر کے مالک و متولی شانتی داس جوہری کو شاہجہاں نے ۱۶۵۶-۵۷ء میں پرگنہ شترنجیہ (پالیتانہ) شترنجیہ کے مندر کے لئے عنایت کیا تھا ۱۶۵۷ء میں جب مراد بخش صوبہ دار گجرات نے اپنی بادشاہت کا اعلان کیا تو اس نے شانتی داس کے نام اسی فرمان کو تازہ کیا تھا۔ ۱۶۶۸ء میں جب اورنگ زیب تخت نشین ہوا تو شانتی داس نے اپنے پانچ لاکھ پچاس ہزار روپیہ جو مراد بخش نے بطور قرض اس سے لیا تھا نیز پرگنہ شترنجیہ کے لئے حضور اقدس میں درخواست کی۔ اورنگ زیب نے گجرات کے متصدیوں کو قرض کی ادائگی کے لئے حکم دیا۔ شانتی داس کو ایک دوسرے فرمان کی رو سے شترنجیہ، آبو، گرنار عبادت گاہوں کے لئے عنایت ہوئے۔

۱۶۶۵ء میں مہابت خان کی صوبہ داری میں ایک فرمان صادر ہوتا ہے جس میں قریب ۳۶ شقیں ہیں اور ان میں سے بیشتر اورنگ زیب ہی کی مذہبی پالیسی سے تعلق رکھتی ہیں اس فرمان سے واضح ہوتا ہے کہ اورنگ زیب نے مسمار کردہ بت خانوں کے دوبارہ تعمیر کئے جانے کی سخت ممانعت کر دی تھی ۱۶۶۵ء سے ۱۶۹۳ء تک ہمیں کوئی ایسا واقعہ نہیں ملتا جس میں کسی مندر کو منہدم کیا گیا ہو مگر ۱۶۹۳ء میں شجاعت خان کے نام حکم صادر ہوا تھا

کہ گجرات کے شہر ڈونگر کا ایک مندر ڈھا دیا جائے اسی طرح ۱۶۷۲ء میں اورنگ زیب نے عہدے داروں کو لکھا کہ سنا جاتا ہے کہ سومناتھ کا مندر دوبارہ تعمیر کیا گیا ہے۔ اور وہاں عبادت کی جاتی ہے اگر ایسا ہے تو تحقیق کے بعد مندر کو منہدم کر دیا جائے۔

غرض سیاسی حالات یا مذہبی تعصب کی بنا پر گجرات میں اورنگ زیب نے یہ رویہ اختیار کیا تھا جہاں اس کے عہد حکومت میں ایک یا دو مندر ڈھا دینے کا حوالہ ملتا ہے تو دوسری طرف منادر کے لئے جاگیریں بھی عنایت کرنے کا پتہ چلتا ہے۔

گجرات کے صوبہ دار کے نام ایک فرمان ایسا بھی پایا جاتا ہے کہ جس کی رو سے مٹی کے ہاتھی گھوڑے (کھلونے) بنانے کی سخت ممانعت کی گئی تھی۔

۱۶۶۵ء کے فرمان سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اورنگ زیب نے ہندو تہوار اور مبارک دن جیسے پانچم۔ ایکادشی۔ اماوس پر دوکانیں بند رکھنا ممنوع قرار دیا۔ اس حکم کا تعلق مذہب سے نہیں معلوم ہوتا۔ دکانیں بار بار بند رہنے سے بازار منڈی میں خرید و فروخت میں بڑی دقت پیش آئی تھی اور اس لئے ایسا حکم جاری کیا گیا تھا اسی فرمان کی رو سے ہولی کا تہوار اور دیوالی پر چراغاں کرنے کی ممانعت کر دی گئی تھی۔ فرمان میں یہ وجہ بتائی گئی تھی کہ ہولی پر راستہ سے جانے والوں کے ہاتھوں میں سے چھڑیاں لے کر آگ میں ڈال دی جاتی ہیں نیز آگ جلانے کے موقع پر نازیبا الفاظ بولے جاتے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ یہ اخلاقی اصلاحات کے پیش نظر کیا گیا تھا دیوالی پر چراغاں نہ کرنے دینے کے کیا اسباب تھے ان سے ہم واقف نہیں ممکن ہے کہ یہ اقتصادی حالات کے پیش نظر کیا گیا ہو مسلمانوں کے عرس اور مقابر پر پرستش پر بھی ایسی ہی کڑی قیدیں لگا دی تھیں۔

اورنگ زیب نے مسلمان کے ساتھ بھی مذہب کے معاملات میں کسی قسم کی رُو

رعایت نہیں کی چوں کہ یہ سنت والجماعت تھا اس لئے اس نے شیعیت کو پھیلنے سے ہر طرح روکا۔ ۱۷۰۳-۰۴ء میں بہ عہدہ نائب صوبہ دار عبدالحمید خاں دولہ بہرے علیسیٰ اور تاج گجرات کے مختلف اضلاع میں شیعیت پھیلانے کی کوشش کر رہے تھے جب اس کی اطلاع اورنگ زیب کو ہوئی تو شہزادہ محمد اعظم صوبہ دار گجرات کو اس امر میں تحقیق کرنے کا حکم دیا۔ محمد اعظم نے ان دونوں کو بمقام احمد آباد کچھ مدت قید میں رکھا اور اس بات سے باز آنے کے وعدہ پر انہیں رہا کر دیا مگر قید سے رہا ہونے کے بعد یہ اپنی حرکتوں سے باز نہ آئے تو انہیں دوبارہ قید کر کے دہلی بھیج دیا گیا ایسا ہی دوسرا واقعہ یہ بیان کیا جاتا ہے کہ خان جی نامی ایک بوہرہ اپنے بارہ مشنریوں کے ساتھ شیعیت کا پرچار کرتا تھا۔ اس نے اس کام کے لئے ایک لاکھ سے زیادہ روپیہ بھی جمع کیا تھا۔ اسے بھی اورنگ زیب کے حکم سے قید کر کے دہلی پہنچا دیا گیا۔ بوہروں کے ان پڑھ بچوں کو سنی طریقہ کی تعلیم دینے کا خاص انتظام کیا گیا تھا۔

اورنگ زیب کے عہد حکومت میں یہاں ایک واقعہ ایسا پایا جاتا ہے کہ مذہبی اسباب کی بنا پر ایک فرقہ کے لوگوں نے اپنے غم و غصہ کا اظہار کرنے کے لئے حکومت کا سامنا کیا اس واقعہ کو بیان کرنے سے پہلے اس فرقہ کے مذہبی عقائد کا مختصر تذکرہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔

پندرہویں صدی عیسوی میں ایک امام شاہ نامی بزرگ ایران سے گجرات میں وارد ہوئے ان کی کچھ کرامت دیکھ کر ہندو قوم کے کنبی فرقہ کے لوگ امام شاہ کے بڑے معتقد ہو گئے۔ انہوں نے گجرات میں بمقام پیرانہ احمد آباد سے بارہ میل کے فاصلہ پر سکونت اختیار کی اور تبلیغ اسلام کے بڑے انوکھے طریقے اختیار کئے اس فرقہ کے لوگ پہلے مخفی طور پر مسلمان ہو جاتے ہیں اور ایک مدت خاص کے بعد اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کرتے ہیں اس

تقریب کو 'پرگٹ' ہونا کہتے ہیں۔ ان میں ایک خلیفہ ہوتا ہے اسے 'کاکا' کہتے ہیں یہ لوگ نہ مسلمان ہوتے ہیں نہ ہندو۔ دونوں مذاہب کے طریقوں پر کاربند رہتے ہیں۔ یہ لوگ ہولی دیوالی بھی مناتے ہیں اور عیدین بھی۔ گوشت اور مچھلی نہیں کھاتے اور روزے بھی رکھتے ہیں ان کے وہاں مردوں کو دفن کیا جاتا ہے مگر اس رسم میں کوئی اسلامی طریقہ نہیں ہوتا۔ دفن کرتے وقت گجراتی میں دو دعائیں پڑھی جاتی ہیں جن میں خدا اور امام شاہ کے ناموں کے ساتھ برہما، وشنو، اندر کے نام بھی شامل ہوتے ہیں شادی بیاہ میں اسلامی طریقہ پر عقد خوانی ہونے کے بعد برہمن کو بلا کر ہندو رسم کے مطابق بھی تمام مراحل طے کئے جاتے ہیں یہ لوگ گجراتی قرآن یا امام شاہ کی کتاب پڑھتے ہیں۔ اس فرقہ کے لوگ احمدآباد جنوبی گجرات اور کچھ میں پائے جاتے ہیں احمدآباد کے امام شاہی موعنے کہلاتے ہیں اور جنوبی گجرات کے ہندو متیلے (مت پرسے) کہلاتے ہیں۔ غرض یہ لوگ دراصل ہندو مگر صوفی مت کے ماننے والے ہیں۔ ان کے تین بڑے مرکز پیرانہ، نوساری اور برہان پور ہیں۔

سنہ ۱۶۸۵ء میں اس فرقہ کے سرگروہ شاہ جی نامی بزرگ تھے جو ان ہی تمام طریقوں پر اپنے معتقدین سے عمل کراتے تھے ممکن ہے اورنگ زیب نے ان ہی باتوں کی روک تھام کرنے کی کوشش کی ہو جس کا نتیجہ شورش تھی۔ اورنگ زیب کو جب اس فرقہ کے اعتقادات اور طریقوں کی خبر ہوئی تو اورنگ زیب نے قاضی احمدآباد کے نام حکم بھیجا کہ شاہ جی کو دہلی روانہ کیا جائے تاکہ ان سے پیغام اسلام کے متعلق مفصل گفتگو کا موقع ملے۔ جب قاضی شہر نے شاہ جی کو بلوایا تو شاہ جی نہ گئے آخر شجاعت خان کی مدد سے شاہ جی کو بلوایا گیا۔ کہا جاتا ہے کہ شاہ جی نے شجاعت خان سے ملاقات کے بعد زہر کھالیا تاکہ دہلی جانے سے نجات پائیں مگر شاہ جی قید حیات سے نجات پا گئے تو شاہ جی کے مریدوں نے

یہ خیال کیا کہ شجاعت خان نے ان کے مرشد کو زہر دے دیا۔ یہ خبر پھیلتے ہی جنوبی گجرات کے متلیسے تعصب کے جوش میں اپنے مرشد کے لئے جان دینے کے خیال سے نربدا عبور کر کے شہر بھروچ میں گھس آئے اور قلعہ پر بھی قابض ہو گئے۔ بھروچ کے فوجدار نے ہر چند اس شورش کو فرو کرنے کی کوشش کی مگر لاحاصل ثابت ہوئی۔ آخر شجاعت خان نے احمد آباد سے فوج روانہ کی۔ چوں کہ متلیوں میں صرف فرقہ وارانہ بحران پھیلا ہوا تھا قلعہ کے دروازہ کھول دیئے اور ایک طرف فوج کے مقابلہ میں لڑتے اور ساتھ ہی ساتھ اپنے فرقہ کے لوگوں کو بھی تہہ تیغ کرتے چلے جاتے اور اس طرح اپنے مرشد پر ہزاروں جانیں قربان کر دیں۔

آفات سماوی :۔

اس دور میں گجرات کو تین چار سخت ترین آفات ارضی و سماوی کا مقابلہ کرنا پڑا۔

سنہ ۱۶۶۴ء میں شیواجی کی لوٹ کھسوٹ کے بعد ابھی حواس بجا نہ ہوئے تھے کہ تمام گجرات میں قحط پڑا۔ اس قحط کا بیان ایسٹ انڈیا کمپنی کے کاغذات سے ملتا ہے۔ گجرات کی اقتصادی حالت پر اس کا بہت گہرا اثر پڑا۔ ابھی قحط کے شکنجے سے نجات نہیں پائی تھی کہ وبا پھیلی۔ یہ ایک قسم کا بخار تھا۔ اس سے دیہاتوں اور شہروں میں بہت جانی نقصان ہوا۔ کمپنی کی یادداشتیں بتاتی ہیں کہ سورت کی کوٹھی میں بھی اکثریت اس کا شکار ہوئی۔ پارسی اور بنیا قوم کو بھی اس وبا سے کافی نقصان ہوا۔

سنہ ۱۶۸۱ء سے سنہ ۱۶۹۲ء تک گجرات میں چھ قحط پڑے۔ سنہ ۱۶۸۱ء میں قحط کی وجہ سے غلہ اتنا گراں ہو گیا کہ ایک عید کے موقع پر گجرات کے صوبہ دار محمد امین بن میر جملہ پر عیدگاہ سے لوٹتے وقت لوگوں نے حملہ کر دیا اور یہ بدقت تمام قلعہ میں پہنچا۔ سنہ ۱۶۸۴ء میں سابرمتی ندی میں سیلاب آیا اور پانی اتنا چڑھا کہ شہر پناہ کو بہت نقصان ہوا اور پانی شہر میں گھس آیا۔

۱۶۸۵ء میں بارش کی کثرت سے فصلیں خراب ہوگئیں اور غلّہ گراں ہوگیا صوبہ دار نے یہ صورتحال دیکھ کر اور نگزیب سے غلہ کا محصول معاف کرالیا اور اس کے بعد تین چار سال یہ محصول وصول نہیں کیا گیا ۱۶۸۶ء میں زیادہ بارش ہونے سے قحط پڑا ۱۶۹۰ء میں سورت بھروچ احمدآباد اور گجرات کے دوسرے حصوں میں دوبارہ وبا پھیلی ۱۶۹۴ء میں جب غلّہ بہت گراں بکنے لگا اور غربا کے لئے بھوکوں مرنے کا وقت آیا تو شجاعت خاں غلّہ پر کنٹرول لایا تاکہ غلہ کے بھاؤ کسی طرح بڑھنے نہ پائیں ۱۶۹۶ء میں سب سے زیادہ سخت قحط پڑا۔ مورخوں کا بیان ہے کہ جودھپور سے پٹن گجرات تک پانی اور گھاس نظر نہ آتے تھے۔

صنعت و حرفت :-

گجرات سلاطین کے زمانہ ہی سے صنعت و حرفت اور تجارت کے لئے آپ اپنی نظیر ثابت ہوچکا تھا سلاطین گجرات نے جس طرح ملک کی زراعت، باغبانی، علوم فنون وغیرہ کی طرف پوری توجہ دی تھی اسی طرح یہاں کی صنعت و حرفت کو بھی بام ترقی پر لے جانے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا بیش قیمت کپڑا، عمدہ کاغذ، صندل کی لکڑی پر ہاتھی دانت کا کام زری کار چوب وغیرہ گجرات کی خاص صنعتیں تھیں مغلوں نے اپنے تسلط کے بعد بھی ان صنعتوں میں کافی دلچسپی لی! ور بہت کشادہ دلی سے اس کی سرپرستی کی۔

شاہی سرپرستی میں بمقام احمدآباد بڑے بڑے کارخانے قائم تھے شاہجہاں نے اپنی صوبہ داری کے زمانہ میں احمدآباد میں ایک کارخانہ قائم کیا تھا۔ اس کارخانے میں دس لاکھ روپیہ کی لاگت سے ایک تخت مرصع تیار کیا گیا تھا ۱۰۲۷ھ میں قلعہ معلیٰ اور تخت طاؤس تیار ہونے پر جو دربار منعقد ہوا تھا اس کے لئے احمدآباد میں ایک لاکھ روپیہ

کی لاگت سے ایک تخت مرصع کرایا گیا تھا۔ اورنگ زیب نے بھی گجرات کی صنعتوں کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا۔ اورنگ زیب شہزادہ محمد اعظم کو ایک خط میں لکھتا ہے کہ گجرات زیب و زینت ہندوستان ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ گجرات کی بنی ہوئی اشیاء نہایت مضبوط، زرق برق اور قیمتی ہوتی ہیں۔ اورنگ زیب کو گجرات کے کھانوں میں بھی ایک کھانا بہت مرغوب تھا۔ اسی شہزادہ کو ایک خط میں لکھتا ہے کہ "مزہ کھچڑی و بریانی شما یاد می آید"

یہاں کا کاغذ اتنا نفیس اور اچھا تیار ہوتا تھا کہ اس صنعت میں کشمیر پر بھی گجرات گوئے سبقت لے گیا۔ اسی طرح کمخواب، سوسی، الاچہ بھی یہاں نہایت اچھا تیار ہوتا تھا زری اور کارچوب کے کام کے لئے آج بھی شہر سورت مشہور ہے۔ اس شہر سے ہر سال کئی کروڑ روپیہ کا مال تیار ہو کر دیس پردیس جاتا ہے۔ آج بھی سوتی کپڑے کے لئے احمد آباد کو ہندوستان کا مانچسٹر کہتے ہیں۔ صندل اور ہاتھی دانت کی اشیا بھی نہایت اچھی تیار کی جاتی تھیں۔ شاہ عالم کے دور حکومت میں بھی شاہی ضروریات کے لئے احمد آباد میں سنسٹھ ہزار کی لاگت سے چار قیمتی شامیانے تیار کرائے گئے تھے۔ یہاں کے کاریگر اتنے اچھے اور اپنے فن میں ایسے یکتا تھے کہ راجہ جے سنگھ نے محمد شاہ کے عہد میں جب جے پور آباد کیا تو احمد آباد سے انعام و اکرام کا لالچ دے کر کاریگروں کو جے پور لے جایا گیا تھا۔

علماء: سرزمین گجرات نے ہر زمانہ میں بڑے بڑے علماء پیدا کئے ہیں یہاں اس دور سے متعلق چند علماء کا ذکر کیا جاتا ہے۔

مولانا احمد کردی گجرات کے علماء میں بہت ممتاز حیثیت رکھتے تھے۔ تمام تمام عمر درس و تدریس کی خدمت انجام دیتے رہے۔ فن کلام میں فیوض القدس مولانا کی قابل ذکر تصنیف ہے ۱۰۸۰ھ میں انہوں نے وفات پائی۔ دوسرے بزرگ سید محمد بن جعفر حسینی

رضوی ہیں انہیں مخدوم جہانیاں کی اولاد میں سے ہونے کا شرف حاصل تھا ان بزرگ کی بھی تمام عمر علمی مشاغل میں گزری۔ قرآن شریف کی دو تفسیریں اور زینۃ النکاۃ فی شرح المشکوٰۃ ان کی تصنیفات میں سے ہیں۔ ۱۱۔۱۱۴۰ھ میں انتقال کیا۔ شیخ جمال الدین چشتی بھی بڑے عالم اور مصنف گذرے ہیں۔ بے شمار کتابوں پر انہوں نے شرحیں لکھی ہیں۔ ان کی تصانیف کی تعداد ایک سو بیالیس بیان کی جاتی ہے ۱۱۲۴ھ میں وفات پائی۔ گجرات کے سب سے بڑے عالم مولانا شیخ نورالدین صدیقی سہروردی تھے۔ مولانا کا ذکر علیحدہ کیا گیا ہے سید علی بن سید جلال بن سید محمد رضوی شاہ عالم بخاری کی اولاد میں سے تھے۔ انہیں شاہجہاں اور اورنگ زیب کے زمانہ میں بڑے بڑے منصب عطا ہوئے تھے ۱۰۶۲ھ میں انہیں شاہی کتب خانہ کا داروغہ بھی مقرر کیا گیا تھا ۱۰۷۰ھ میں جب شاہی خدمات سے مستعفی ہو گئے تو اورنگ زیب نے بارہ ہزار روپیہ سالانہ وظیفہ مقرر کر دیا تھا ۱۰۷۳ھ میں دوبارہ منصب و خلعت عطا کئے گئے ۱۰۹۱ھ میں وفات پائی۔

یہاں عالمگیری دور کے چند قاضیوں کا ذکر بھی مناسب معلوم ہوتا ہے اس دور کے سب سے زیادہ با اقتدار قاضی قاضی عبدالوہاب گذرے ہیں۔ اورنگ زیب اپنی صوبہ داری گجرات کے زمانہ سے قاضی صاحب موصوف سے بہت زیادہ مرعوب تھا۔ قاضی صاحب نے ۱۰۸۶ھ میں انتقال کیا۔ قاضی شیخ السلام قاضی عبدالوہاب کے بیٹے اپنے والد کے بعد قاضی القضاۃ کے عہدے پر فائز ہوئے۔ یہ نہایت متقی و پرہیزگار تھے۔ انہوں نے اپنے والد کی دولت اور اثاث البیت میں سے ایک حبہ نہیں لیا۔ ۱۰۹۴ھ میں اپنے عہدے سے مستعفی ہو کر حج بیت اللہ کو چلے گئے یہ نہایت راستباز اور صاف گو تھے ۱۱۰۹ھ میں وفات پائی۔ قاضی عبدالوہاب کے داماد قاضی ابوسعید ۱۰۸۶ھ میں دہلی کے قاضی مقرر

ہوئے تھے۔ ۱۰۹۴ھ میں انہیں گجرات میں قاضی القضاۃ کے عہدے پر مقرر کیا گیا۔ ۱۰۹۹ھ میں وفات پائی۔ قاضی عبداللہ قاضی ابوسعید کے بعد قاضی القضاۃ کے عہدے پر فائز ہوئے آخر وقت میں انہیں صدر الصدوری کی خدمت پر مامور کیا گیا تھا۔ ۱۱۰۹ھ میں وفات پائی۔ قاضی عبدالحمید بن قاضی عبداللہ اس دور میں صوبہ گجرات کے دیوان، سورت کے متصدی اور زمانہ فرخ سیر میں خدمت شاہی پر فائز رہے۔ قاضی اکرام الدین قاضی عبدالوہاب کے پوتے تھے۔ انہیں شاہ عالم نے شیخ الاسلام کا خطاب عنایت کیا تھا۔ اکرام الدین نے اپنے استاد و مرشد مولانا نورالدین کے لئے احمد آباد میں ۱۱۱۱ھ میں ایک عالی خان مدرسہ تعمیر کرایا تھا۔ ان بزرگوں کے علاوہ شریعت خاں بن قاضی عبداللہ، متشرع خاں بن قاضی شریعت خاں، نورالحق بن قاضی عبدالوہاب اور عبدالوہاب کے فرزند نورالحق اور عبدالحق بھی گجرات کے علماء و فضلاء میں قابلِ ذکر ہیں۔

مدارس :-

سلاطین گجرات کے زمانہ کی تاریخ اس امر کی شاہد ہے کہ ان تاجداروں نے علوم و فنون کی سرپرستی میں کسی قسم کی کوتاہی نہیں کی مگر گجرات پر مغلوں کا تسلط ہو جانے کے بعد بھی گجرات علوم و فنون کا ایک مرکز رہا۔ احمد آباد اپنے مدارس کے لئے مشہور تھا یہاں بڑے بڑے علماء کا اجتماع رہا ہے جن کے متعلق عرض کیا جا چکا ہے۔ چوں کہ اورنگ زیب خود بہت علم دوست بادشاہ گذرا ہے۔ اس لئے علوم کی اس زمانہ میں بڑی قدر و منزلت تھی اس کا بڑا ثبوت گجرات کے بلند پایہ مدارس ہیں۔ یہاں گجرات کے چند مدارس کا ذکر کیا جاتا ہے جو چراغ علم و ہدایت منور کئے ہوئے تھے اور صدہا طالبان علم ان چشمہائے فیض سے سیراب ہوتے رہے۔

احمد آباد میں علامہ شاہ وجیہ الدین علوی گجراتی متوفی سنہ ۹۶۹ھ کا مدرسہ قابل ذکر ہے۔ اس مدرسہ میں تقریباً پینسٹھ سال علامہ موصوف نے درس و تدریس کے فرائض انجام دیئے۔ علامہ کے بعد آپ کے فرزند مولانا عبداللہ اس خدمت کو انجام دیتے رہے۔ مولانا عبداللہ کے بعد علامہ کے پوتے نے بھی روایات ماضی کو زندہ رکھا اس مدرسہ میں طلبا کے لئے دارالاقامت بھی تھا۔ آج بھی اس عمارت کے حجرے بوسیدہ حالت میں اپنی دیرینہ شان و شوکت کی گواہی دیتے ہیں۔ یہ مدرسہ محلہ خان پور میں واقع ہے اسی جگہ علامہ آسودہ خاک ہیں۔ احمد آباد میں قلعہ کے مقابل ایک امیر سیف خاں نے بھی سنہ ۱۰۳۲ھ میں مدرسہ تعمیر کرایا تھا۔

احمد آباد کا سب سے مشہور و معروف مدرسہ ہدایت بخش ہے۔ یہ مدرسہ مولانا شیخ نورالدین صدیقی سہروردی کے ایک شاگرد و عقیدت مند نواب اکرم الدین نے ایک لاکھ چوبیس ہزار روپیہ کی لاگت سے تعمیر کرایا تھا۔ اس مدرسہ کا سنگ بنیاد سنہ ۱۱۰۲ھ میں رکھا گیا اور سنہ ۱۱۱۱ھ میں یہ عمارت تکمیل کو پہنچی۔ اس وقت بھی اس مدرسہ اور مسجد کے آثار محلہ آسلوڑیا میں ہماری عبرت کے لئے موجود ہیں۔ مدرسہ کے اخراجات کے لئے نواب موصوف نے کئی دیہات وقف کر دئے تھے سنہ ۱۱۵۵ھ تک مولانا اس مدرسہ میں درس و تدریس کا کام کرتے رہے۔ ولی نے اسی مدرسہ کی تعریف میں ایک رسالہ نورالمعرفت لکھا ہے۔ احمد آباد کے مقبول عام صوبہ دار شجاعت خان نے اپنی صوبیداری کے زمانہ میں بہت عالی شان مدرسہ بنوایا تھا۔ اس وقت بھی یہ مدرسہ بہت اچھی حالت میں موجود ہے اور یتیم خانہ کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔

شہر سورت میں بھی اس زمانہ میں دو بڑے مدرسے علم و دین کی روشنی پھیلا

رہے تھے۔ بمقام برہادی بازار سید محمد بن سید عبداللہ العیدروس کے مزار کے متصل حاجی زاہد بیگ نے ۱۰۴۱ھ میں ایک مدرسہ تعمیر کرایا تھا۔ اس مدرسہ میں اسی برگزیدہ خاندان کے چند افراد عرصہ تک درس و تدریس کی خدمت انجام دیتے رہے۔ نواب ظفر یاب خان نے بھی مرجان شامی کی مسجد سے متصل ایک مدرسہ تعمیر کرایا تھا۔ جو اس دور میں طالبان علم کی ضروریات کو پورا کرتا رہا۔

اُردو ادب :-

اُردو کی ابتدائی نشو و نما سلاطین گجرات کے آخری دور میں ہوئی مگر جب ان کی حکومت کا کھیل بگڑا تو اس کی یہ خوش قسمتی تھی کہ تاجدار دکن نے اس کی سرپرستی کا بیڑا اٹھالیا۔ اس طرح اردو کی ترقی و توسیع میں فرق نہ آنے پایا۔ اور اس کو اپنے ارتقائی مدارج طے کرنے کا زریں موقع مل گیا۔ اس وقت اردو ادب کے جس دور کا جائزہ مقصود ہے وہ ادب کا دوسرا دور ہے۔ اس دور میں شاعری کی تقریباً ہر صنف نے کافی ترقی کی اس دور کے ادبی کارناموں کا سرسری بیان یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے۔

بیجاپور کا فرماں روا علی عادل شاہ ثانی (۱۰۶۷ھ تا ۱۰۸۳ھ) بڑا صاحب ذوق تھا۔ اس نے اپنے اسلاف کی روایات کو زندہ رکھا اور اردو کی سرپرستی میں فراخ دلی کا ثبوت دیا۔ اس عہد کا قابل ذکر شاعر نصرتی ہے۔ مولوی نصیر الدین ہاشمی کا بیان ہے کہ اورنگ زیب نے فتح بیجاپور کے بعد اسے ملک الشعراء کا خطاب عطا کیا تھا۔ اس سے دو مثنویاں یادگار ہیں ایک بزمیہ مثنوی گلشن عشق اور دوسری رزمیہ مثنوی علی نامہ ہے علی نامہ شیواجی اور سلطان کے درمیان کی معرکتہ الآراء جنگ کا احوال ہے۔ نصرتی اپنے قصائد کے لئے بھی مشہور ہے اس زمانہ کی زبان کو دیکھتے ہوئے اس کے قصائد آپ

اپنی نظر ہیں۔ اس دور کا ایک شاعر ملک خوشنود اپنی مذہبی مثنوی احکام الصلوٰۃ کی وجہ سے مشہور ہے۔ شمس العشاق میراں جی کے پوتے امین الدین اعلیٰ بھی اسی دور سے تعلق رکھتے ہیں۔ اعلیٰ نے سلوک و معرفت میں نظم وجودیہ، رموز السالکین اور نظم قبریہ لکھی۔ بیجاپور کا آخری تاجدار سکندر عادل شاہ (۱۰۸۳ھ تا ۱۰۹۷ھ) گذرا ہے۔ اگرچہ اس کے قلیل عہد حکومت میں خانہ جنگیوں کی وجہ سے نظام حکومت درہم برہم ہو گیا تھا اور ہر طرف ابتری پھیلی ہوئی تھی تاہم علم و ادب کا بازار سرد نہ ہونے پایا تھا۔ اس عہد کے نامور شعرا میں سیوا کا نام ملتا ہے اس نے روضۃ الشہدا کو اردو کا جامہ پہنایا۔ شاعر مومن نے اس دور میں سید محمد جون پوری کے حالات کو منظوم کیا اور اس کا نام اسرار عشق رکھا۔ بیجاپور کا آخری اور قابل ذکر شاعر ہاشمی ہے یہ مادر زاد نابینا تھا۔ اس کی مثنوی یوسف زلیخا بہت مشہور ہے۔

بیجاپور کی طرح گول کنڈہ کے حکمرانوں نے بھی اردو کی ترقی و توسیع میں بہت دلچسپی لی۔ عبداللہ قطب شاہ (۱۰۳۵ھ تا ۱۰۸۳ھ) کا عہد حکومت اردو کے لئے بہت مبارک گذرا ہے۔ اس عہد میں دکن میں بہت بلند پایہ شاعر گذرے ہیں جنہوں نے شاعری کے معیار کو آسمان پر پہنچا دیا تھا اس سلطنت کے تین فرماں روا ریختہ کے دلدادہ تھے عبداللہ اور اس کے دو پیش رو سلطان صاحب دیوان گذرے ہیں۔ یہ عجیب بات ہے کہ ریختہ کو خود شاہان وقت نے پسند کیا اور اس میں طبع آزمائی بھی کی لیکن ان کے دور میں اس ریختہ نے کوئی قابل ذکر فروغ حاصل نہیں کیا بلکہ مثنوی ہی کا طوطی بولتا تھا اور جتنے بڑے شاعر گذرے ہیں انہوں نے مثنوی ہی میں اپنے کمال فن کا ثبوت دیا ہے۔ بظاہر اس کے اسباب یہ معلوم ہوتے ہیں کہ مثنوی میں باکمالوں کو اپنی صلاحیتوں اور قادرالکلامی کے اظہار کا بہت موقع ملتا ہے۔ دوسرے ریختہ اور اس کی زبان میں وہ تازگی اور توانائی پیدا نہیں

ہوئی تھی۔ جو اس کی مقبولیت کا سبب بنتی۔ اسے کسی مصلح و مجتہد کی ضرورت تھی جس ضرورتا کو بعد میں ولی نے پورا کیا۔ اس دور کے دو نامور شاعر غواصی اور ابن نشاطی ہیں غواصی نے ۱۰۳۵ھ میں مثنوی سیف الملوک و بدیع الجمال لکھی اور ابن نشاطی نے مثنوی پھول بن (۱۰۶۱ھ) اور طوطی نامہ یادگار چھوڑی ہیں۔ پھول بن نہایت مرصع مثنوی ہے اس میں شاعر نے اپنے کمال فن کا بہترین ثبوت دیا ہے۔ ۱۱۶۴ھ میں ایک شاعر جنیدی نے قصہ ابوشحمہ نظم کیا۔ اس شاعر کی ایک مثنوی ماہ پیکر بھی مشہور ہے عبداللہ کے آخری دور کے شعراء میں طبعی قابل ذکر ہے اس نے ۱۰۸۱ھ میں ایک بزمیہ مثنوی بہرام و گل اندام لکھی اس سلطنت کا آخری تاجدار ابوالحسن (۱۰۸۳ھ تا ۱۰۹۶ھ) تھا اس عہد کے ایک شاعر فائز نے ۱۰۹۴ھ میں ایک مذہبی مثنوی قصہ رضوان شاہ و روح افزا یادگار چھوڑی ہے۔ اسی دور کا ایک شاعر لطیف ہے۔ لطیف نے ۱۰۹۵ھ میں مذہبی مثنوی ظفر نامہ لکھی۔

۱۰۹۷ھ سے دکن میں مغلیہ دور شروع ہوا۔ اگرچہ مغلوں کے تسلط کے بعد اردو کی سرپرستی کو بڑا دھکا پہنچا شعرا نے روز بد دیکھا اردو کے شاعروں کی قدر و منزلت کم ہو گئی فارسی کا دور شروع ہوا تاہم اردو کے چند اعلیٰ پایے کے مثنوی نگار اس دور میں بھی پائے جاتے ہیں۔ اس دور میں ایک فرق یہ پایا جاتا ہے کہ شعرا نے درباروں کی بے رونقی اور سرپرستی کے فقدان کی وجہ سے بزمیہ مثنویاں لکھنا ترک کر دیا اور چوں کہ یہ دور نشہ عیش و عشرت کے خمار کا دور تھا۔ اس لئے شعرا اپنی اس سیاہ بختی کو اپنے اعمال کی پاداش سمجھ کر نجات کے طالب ہوئے اور اس کے لئے مذہبی مثنویوں کو آلہ کار بنایا اور اپنے پریشان دل و دماغ کو اس طریقہ پر تسکین دینا چاہا۔

اس دور میں تقریباً تمام مذہبی مثنویاں پائی جاتی ہیں مغلیہ دور کا بڑا شاعر ولی دیوری گذرا ہے۔ اس کی وہ مجلس (۱۱۹۱ھ) مشہور ہے۔ اس مثنوی کے لئے ایک عرصہ تک مغالطہ رہا۔ اور ولی گجراتی سے منسوب کی جاتی تھی اور سنہ تصنیف ۱۱۴۵ھ بیان کیا جاتا تھا۔ اس دور میں محمود بحری نے ایک متصوفانہ مثنوی من لگن ۱۱۱۱ھ میں لکھی۔ عشرتی بھی اسی دور سے تعلق رکھتا ہے اس نے تصوف میں دو مثنویاں چت لگن اور دیپک پتنگ یادگار چھوڑیں شاعر ضعیفی کی مذہبی مثنوی ہدایت نامہ بھی مشہور ہے۔ حسین ذوقی نے سب رس کے قصہ کو منظوم کیا اور وصال العاشقین اس کا نام رکھا۔ اسی شاعر کی دوسری مثنوی غوث اعظم کی منقبت ہے۔ اس دور کے شاعر مجرمی نے ۱۱۱۱ھ میں سب رس کو منظوم کیا اس کا نام گلشن حسن و دل ہے۔

گجرات عہد اکبر سے مغلیہ حکومت کے زیر نگیں تھا۔ اردو کو اس جگہ کوئی سرپرستی حاصل نہیں تھی۔ اردو کی خدمت یا تو صوفیا اور مشائخ نے انجام دی یا صوفی مشرب شعرا نے مذہبی مثنویاں لکھ کر اردو کی ترقی میں حصہ لیا۔ دکن کی طرح یہاں امیروں کے دربار دل میں اس کا گذر نہیں تھا اس لئے گجرات میں اچھے مثنوی نگار پیدا نہیں ہوئے یہی وجہ ہے کہ یہاں رزمیہ اور بزمیہ مثنویاں نہیں پائی جاتیں اور جو ایک دو ملتی ہیں وہ ادبی حیثیت سے کوئی وقعت نہیں رکھتیں۔ اسی دور میں اس کے بعد تیرھویں صدی کے وسط تک یہاں مذہبی مثنویاں کثرت سے پائی جاتی ہیں۔ گجرات کے مثنوی نگاروں میں سے چند حسب ذیل ہیں۔

مسکین ایک شاعر گذرا ہے جس نے ۱۰۹۲ھ میں چند مذہبی مثنویاں لکھی ہیں ان میں جنگ نامہ محمد حنیف مشہور ہے۔ اس موضوع پر دکن میں بھی مثنویاں لکھی گئی ہیں

یہ موضوع اتنا مقبول تھا کہ پنجابی زبان میں بھی اس پر مثنویاں دستیاب ہوتی ہیں۔ اس دور میں گودھرہ کے دو نامور شاعر محمد امین اور محمد فتح گذرے ہیں۔ محمد امین نے ۱۱۰۹ھ میں یوسف زلیخا لکھی یہ ہاشمی کا ہمعصر تھا۔ ان دونوں کی ایک ہی موضوع پر مثنویوں کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہیں۔ امین کی ایک مثنوی تولد نامہ (مع معراج نامہ اور وفات نامہ) پائی جاتی ہے۔ امین کے ہمعصر اور ہم وطن محمد فتح نے ایک مذہبی مثنوی یوسف ثانی یادگار چھوڑی ہے۔ مثنوی کا موضوع چند فقہ کے مسائل ہیں جنھیں ایک فرضی قصہ میں چسپاں کیا گیا ہے۔ اس ڈھنگ کی مثنویاں دکن میں بھی پائی جاتی ہیں۔ مذہب کی تبلیغ و اشاعت کے لئے معلوم ہوتا ہے یہ طریقہ بہت موثر ثابت ہوا تھا۔ اس دور کے ایک قابل ذکر صوفی شاعر پیر مشائخ (۱۰۶۰ھ تا ۱۱۲۱ھ) ہیں۔ پیر صاحب نے مذہب اسلام کی تبلیغ اور اسلامی عقائد کو اپنے حلقۂ عقیدت منداں میں پھیلانے کی غرض سے کافی تعداد میں چھوٹی چھوٹی مثنویاں اور نظمیں لکھیں۔ اس دور کے بعد بھی یہاں بیشمار مذہبی مثنویاں لکھی گئیں۔

الغرض گجرات اور دکن کے ادب کے جائزہ سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اس دور میں مثنوی کو بڑا فروغ حاصل ہوا۔ شاہان دکن کی سرپرستی کی وجہ سے بزمیہ اور رزمیہ مثنویاں لکھی گئیں۔ امیروں کی درباداری کی وجہ سے دکن میں قصائد بھی پائے جاتے ہیں۔ تاجداران بیجاپور کے ذوق حسن و عشق کی وجہ سے صنف غزل میں بھی طبع آزمائی کی گئی۔ صوفیائے کرام نے مذہب کے پھیلانے کی غرض سے مذہبی مثنویاں لکھیں، ان کے تتبع میں غیر صوفیوں نے بھی اس طرز کو اختیار کیا۔ شہدائے کربلا کے پرستاروں نے مرثیے لکھے اور اس طرح ادب کا کافی ذخیرہ اس وقت تک جمع ہو گیا۔ اس ادب کو دیکھنے

سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ۔ِ فنیُل ہندی تھا۔ اگرچہ زبان میں کافی وسعت پیدا ہو چکی تھی تاہم محتاج اصلاح معلوم ہوتی ہے.

دکن میں بہترین شاعر پیدا ہوئے نثر نگاروں نے بھی خدمت انجام دی مگر کوئی مصلح پیدا نہ ہوا جو زبان و ادب کا رُخ بدل دیتا۔ یہ چیز ہمارے شاعر ولی کے حصہ میں آئی تھی ۔

RekhtaDownload.com

سوانح حیات

نام اور نسب :- جس طرح ولی کے وطن کے بارے میں محققین کی رائیں مختلف ہیں اسی طرح ولی کا صحیح نام بھی اہل علم کے لئے ایک معمّا بن گیا ہے۔ تذکرہ نویسوں کے یہاں شاعر کے نام کی مختلف صورتیں ولی اللہ، شمس ولی اللہ، محمد ولی، ولی محمد پائی جاتی ہیں میر حسن، میرزا علی لطف اور عبدالغفور نساخ نے ولی اللہ لکھا ہے۔ آزاد اور نواب علی ابراہیم خاں شمس ولی اللہ لکھتے ہیں۔ فتح علی گردیزی، شفیق اورنگ آبادی ثناء اللہ فانی اسے ولی محمد کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ ان تذکرہ نویسوں کے بیانات کے علاوہ احمد آباد کے مشہور عالم اور بزرگ شاہ وجیہ الدین کے خاندان کے ایک ممتاز رکن جناب سیّد منظور حسین علوی المعروف بہ حسینی پیر صاحب ایسی چند دستاویز فراہم کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں جن پر ولی اور خاندان کے دوسرے ارکان کے دستخط ثبت ہیں مثلاً شاہ وجیہ الدین کے خاندان کے ایک اہم محضر پر ولی کی یہ مہر پائی جاتی ہے :-

(۱) "خاک نعلین غوثی محمد ولی اللہ شریف محمد علوی"۔

پروفیسر سید نجیب اشرف صاحب ندوی کے پاس ۱۱۱۸ھ کا ایک نمسک نامہ ہے جس میں بہ حیثیت گواہ ولی اور اس کے دو بیٹوں کے دستخط ہیں۔ ولی نے گواہ کی حیثیت سے یہ عبارت لکھی ہے :-

(۲) "بمضمون متن سید لطف اللہ اقرار نمودند۔ حررہٗ محمد ولی اللہ بن شریف محمد العلوی"۔

بیٹوں کے دستخط یہ ہیں:۔

(۳) "قد اطلع علیٰ ذالک الفقیر الی اللہ الغنی احمد ولی اللہ بن محمد شریف العلوی"

(۴) "من المطلعین محمد مجتبیٰ ابن ولی اللہ العلوی"۔

(۵) "احمد بن محمد ولی اللہ العلوی"۔

ولی کے ہم جد حضرت سید عبدالملک نے ملفوظ کبیری مولفہ ۱۰۴۵ھ تا ۱۰۶۱ھ میں شریف محمد (ولی کے والد) کی اولاد کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:۔

"از محمد شریف چار پسر ــ میاں عبدالرحمٰن و میاں حبیب اللہ و میاں خلیل اللہ و میاں ولی اللہ و دو دختر" ولی شاہ وجیہ الدین علوی گجراتی قدس سرہٗ کے بھائی شاہ نصر اللہ کی اولاد سے تھا۔ اس کا سلسلۂ نسب یہ ہے[۲]:۔

شاہ ولی اللہ بن شریف محمد متوفی ۱۱۷۶ھ بن سید عبدالرحمٰن بن سید احمد متوفی ۱۰۴۹ھ بن سید بہاؤ الدین بن حضرت شاہ نصر اللہ حسینی (برادر حقیقی حضرت قطب العارفین علامہ شاہ وجیہ الدین رحمۃ اللہ علیہ)

ان اسناد کے تجزیہ سے پتہ چلتا ہے کہ خود ولی اپنا نام محمد ولی اللہ لکھتا ہے جیسا کہ ۱ اور ۵ سے ظاہر ہے ۳ اور ۴ میں اس کے بیٹوں نے ولی اللہ لکھا ہے اسی طرح ۲ اور ۳ میں ولی کے والد کا نام شریف محمد اور محمد شریف پایا جاتا ہے۔

عبدالملک نے ملفوظ کبیری میں ولی اللہ اور والد کا نام محمد شریف لکھا اور نسب نامہ میں شاہ ولی اللہ پایا جاتا ہے۔ علامہ وجیہ الدین کے خاندان کے اکثر ناموں کے ساتھ

'شاہ' کا لفظ آتا ہے جیسے شاہ وجیہ الدّین، شاہ محمد (پسر شاہ وجیہ الدین) شاہ نصر اللہ برادر شاہ وجیہ الدین. غالباً اسی وجہ سے نسب نامہ میں ولی کے پہلے شاہ کا لفظ موجود ہے. الغرض ولی کے خود اپنے بیان کی بنا پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کا پورا نام محمد ولی اللہ ہوگا۔ عبدالملک نے ملفوظات کبیری میں ولی کا نام آخر میں لکھا ہے جس سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ ولی اپنے بھائیوں میں سب سے چھوٹا ہوگا.

وطن:- ولی کے سوانح حیات کے سلسلہ میں سب سے اہم اور دلچسپی کا باعث اس کے وطن کا مسئلہ ہے جس پر دور حاضر کے بعض فضلاء نے تحقیق و نکتہ آفرینی کی داد دی ہے ان اہل علم میں ایک بہت بڑی اکثریت دکھنی حضرات کی ہے جنھوں نے ولی کے متعلق اپنی تحقیقات کی رو سے اردو ادب میں ایک گراں قدر اضافہ کیا ہے. ان حضرات نے ولی کے دکھنی ہونے کا صور اس بلند آہنگی سے پھونکا کہ ملک کے بعض نامور محققین نے اس دعوے کی صحت کو تسلیم کر لیا. اور اصل حقیقت جاننے کی طرف کوئی توجہ نہ کی. ۱۹۳۷ء میں مملکت آصفیہ میں ولی کی دو صد سالہ برسی کے جشن کے موقع پر نہایت واضح اور تحدی آمیز انداز میں یہ اعلان کیا گیا کہ

> "اس کے بعد گجرات کا کوئی قدر دانِ ولی خواہ وہ تذکرہ شعرائے گجرات کا مولف ہو یا کوئی اور محب گجرات ولی کو گجراتی کہنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔"[1]

ولی کی وطنیت سے متعلق دکن کے اہل علم نے جو کچھ لکھا ہے اسے دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ اسے دکھنی ثابت کرنے میں محض قیاس آرائی سے کام لیا گیا ہے اور اس کے گجرات سے تعلقات اور وابستگیوں کے شواہد کو لائق اہمیت نہیں دی گئی اور نہ ہی

قدیم تذکروں کے بیانات کے پیش نظر علامہ وجیہ الدین کے خاندان کے ارکان سے صحیح حالات معلوم کرنے کی زحمت گوارا کی گئی۔

تھوڑی دیر کے لئے فرض کر لیجئے کہ ولی کو علامہ وجیہ الدین کے خاندان سے کوئی تعلق نہ تھا تاہم ولی کو دکھنی ثابت کرنے کے لئے جو دلائل پیش کئے گئے ہیں ان کی روشنی میں بھی ولی دکھنی نہیں ٹھہرتا بلکہ اس کے گجراتی ہونے کا امکان زیادہ پایا جاتا ہے۔ وطنیت کے سلسلہ میں جو چیزیں مفید مطلب ہیں وہ یہ ہیں :-

(۱) تذکرہ نویسوں کے بیانات۔

(۲) ولی کے چند اشعار متعلق دکن۔

(۳) ولی کے کلام کے قلمی نسخوں پر لکھے ہوئے نام (ولی دکھنی یا متوطن دکن)

(۴) ولی کا فراق گجرات والا قطعہ۔

(۵) ولی کے کلام کا لسانی پہلو۔

(۶) ولی کے کلام میں معاصرین کا ذکر۔

جہاں تک تذکروں کا تعلق ہے ولی کی وفات کے ۴۶ سال بعد ولی کا تذکرہ سب سے پہلے خواجہ خان حمید اورنگ آبادی کی تصنیف گلشن گفتار (۱۱۶۵ھ کی تالیف) میں ملتا ہے اس کے بعد دوسرے تذکروں میں بھی اس کا ذکر پایا جاتا ہے جن میں بعض نے گجراتی لکھا ہے اور بعض اسے دکن سے منسوب کرتے ہیں ہم یہاں تمام تذکرہ نگاروں کی قلمی شہادتیں پیش کرتے ہیں۔ پہلے ان تذکروں کے بیانات کو ملاحظہ فرمایئے جنہوں نے ولی کو گجراتی لکھا ہے :-

۱۔ ولی کے قریب العہد آصف جاہی دربار کے گرامی منزلت امیر خواجہ

خان حمید اورنگ آبادی اپنی تصنیف (۱۱۶۵ھ) میں لکھتے ہیں :-

"ولی محمد ولی احمد آبادی عجب فکر رسائے داشت و دیوان دلچسپ رنگینے طرح نمودہ اکثر اوقات خود در طلب علم گزرانیدہ در بلدہ دارالسرور برہان پور نیز مدتے سکونت داشت و بجانب میاں سید معالی کہ از مشائخ زادہائے گجرات بودند میل تمام داشت۔ دیوان مشہور و معروف دارد آخر عمر در گجرات وفات نمود۔"

۲۔ شیخ قیام الدین قائم چاندپوری مخزن نکات (۱۱۶۸ھ) میں رقمطراز ہیں:-

"شاہ ولی اللہ ولی متخلص شاعرے ست مشہور مولدش گجرات است گویند بہ نسبت فرزندی شاہ وجیہ الدین گجراتی کہ اولیائے مشاہیر است افتخار ہا داشت در سن چہل و چہار از جلوس عالمگیر بادشاہ ہمراہ میر ابو المعالی نام سید پسرے کہ دلش فریفتہ او بود بجہان آباد آمد۔"

۳۔ میر حسن تذکرۂ شعرائے اردو ۱۱۸۳ھ میں لکھتے ہیں :-

"شاہ ولی اللہ، المتخلص بہ ولی، مشہور و معروف مردے بود از خاک گجرات۔"

۴۔ نواب ابراہیم خان اپنی تالیف گلزار ابراہیم ۱۱۹۸ھ میں لکھتے ہیں :-

"ولی دکھنی شاہ ولی اللہ۔ اصلش گجرات۔ در شعرائے دکن مشہور و ممتاز ست گویند در زمان عالم گیر بادشاہ بہ ہندوستان آمدہ مستفید از شاہ گلشن گردید۔ از مشاہیر ریختہ گویان او اوّل کسے ست کہ دیوانش در دکھن مشتہر و مدون گشتہ۔"

۵۔ قاضی سید نور الدین فائق مولف مخزن شعراء ۱۲۶۸ھ فرماتے ہیں :-

"ولی تخلص محمد ولی نام مولدش احمد آباد و مدفنش ہم ہماں بلدہ حجستہ بنیاد و مدفنش مابین مزار موسی سہاگ و شاہی باغ اوّل کسے کہ آئینہ سخن بندی را بہ صیقل گری

نظم جلا بخشید و ریختہ را بہ گرمی بلاغت نشانید ہمیں است، دریں باب سرگروہ و مقدمۃ الجیش جمیع شاعران ہند و گجرات ست، بر ضمائر انجم نظائر ناظران ہوشمند مخفی و محتجب نماند کہ محققان ایں فن را در حال او اختلاف است کہ آیا ولی از گجرات است و یا از دکن، اما بہ راقم آثم از زبانی ثقات بلدۂ احمد آباد بہ ثبوت چناں پیوستہ کہ شاعر مزبور از بلدۂ مسطور بودہ و سالہا بدکھن ہم گذرانیدہ۔"

۶۔ عبدالغفور نساخ سخن شعرا ۱۲۸۱ھ میں لکھتے ہیں:۔

"شاہ ولی اللہ اولاد میں شاہ وجیہ الدین گجراتی علیہ الرحمۃ کے تھے عالمگیر بادشاہ کے عہد میں دہلی میں آئے تھے بعضے تذکرہ والوں نے ان کا نام ولی محمد لکھا ہے اور ان کو موجد ریختہ جانتے ہیں.... وغیرہ

۷۔ حافظ سید ممتاز علی بھوپالی آثار الشعرا ۱۳۰۴ھ میں لکھتے ہیں:۔

ولی اللہ احمد آباد گجرات کے باشندے جو شاہ وجیہ الدین کے خاندان سے تھے ابوالمعالی کے ساتھ دہلی میں آئے تھے۔

۸۔ آزاد آب حیات میں لکھتے ہیں۔

"ولی احمد آباد گجرات کے رہنے والے تھے اور شاہ وجیہ الدین کے مشہور خاندان میں سے تھے۔"

سنہ ۱۱۸۸ھ

ان کے علاوہ منشی قدرت اللہ صدیقی مراد آبادی مرتب طبقات الشعرا۔ شیخ غلام محی الدین قریشی مولف تذکرہ طبقات سخن سنہ ۱۲۲۳ھ

شیخ احمد بخش میاں مصنف حدیقۂ احمدی متوفی سنہ ۱۲۶۵ھ

غلام محمد منظور مرتب دیوان ولی سنہ ۱۲۹۰ھ وغیرہ ولی کے گجراتی اور

احمد آبادی ہونے میں متفق الرائے ہیں۔

دیوان ولی کے یورپ میں کئی نسخے ہیں ولی کے سلسلہ میں جو صراحت مستفرق فہرستوں میں کی گئی ہے وہ حسب ذیل ہے۔

بلوم ہارٹ کے معلومات کا خلاصہ۔

ولی دکھنی جن کا نام شاہ ولی اللہ تھا بعض محمد ولی اور بعض ولی اللہ سے موسوم کرتے ہیں۔ ولی الدین بھی کہا گیا ہے۔ یہ احمد آباد گجرات کے رہنے والے تھے، شاہ وجیہ الدین کے مریدوں میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ ابوالمعالی کے ساتھ اورنگ زیب کے عہد ۱۱۱۲ھ (۱۷۰۰ء) میں دہلی گئے یہاں سعد اللہ گلشن سے ملاقات کی۔ پہلی مرتبہ فارسی کے بجائے ریختہ نظم لکھی ؎

۲۔ اکسفرڈ کٹیلاگ۔

"ہندوستان کے ممتاز شاعر شاہ محمد ولی گجراتی ان کا تخلص ولی تھا وغیرہ

۳۔ اڈنبرا کی فہرست میں لکھا ہے۔

"شاہ ولی اللہ گجرات کے باشندے تھے دکھن میں سکونت اختیار کر لی تھی"۔

۴۔ اسپرنگر کی فہرست۔

"ولی گجراتی ان کے دیوان کے بکثرت نسخے ہندوستان میں پائے جاتے ہیں"۔

اب ان تذکروں کے بیانات ملاحظہ فرمایئے جنہوں نے ولی کے وطن کے لئے لفظ دکن لکھا ہے یا اسے دکنی قرار دیا ہے ؎

۱۔ فتح علی الحسینی گردیزی کا تذکرہ "تذکرۂ ریختہ گویاں" ولی کے قریب العہد یعنی ۱۱۶۶ھ کی تالیف ہے اس میں یہ الفاظ پائے جاتے ہیں۔ "محمد ولی در دکن

چہرہ ہستی افروختہ۔"

۲۔ لچھمی نرائن شفیق اورنگ آبادی کی تالیف چمنستان شعرا ۱۱۷۵ھ میں یہ پایا جاتا ہے۔ "مولد او خاک پاک اورنگ آباد ست۔"

۳۔ حکیم قدرت اللہ قاسم کے تذکرہ مجموعۂ نغز ۱۲۲۱ھ میں یہ الفاظ ہیں۔

"از سکنہ دیار دکن۔"

۴۔ میر تقی میر نکات الشعرا ۱۱۶۵ھ میں لکھتے ہیں۔

شاعر ریختہ از خاک اورنگ آباد ست
واحوالش کما ینبغی معلوم من نیست

ان کے علاوہ چند اور تذکرے ایسے ہیں جن میں ولی کو دکنی لکھا گیا ہے اور اس صدی میں اہل دکن کے علاوہ صاحب گل رعنا، رام بابو سکسینہ، احسن مارہروی مرتبہ، کلیات ولی ۱۹۲۹ء نے صاف صاف دکنی لکھا ہے۔

چوں کہ موجودہ صدی کے تذکرہ نگاروں کے بیانات کے ماخذ اکثر قدیم تذکرے ہیں اس لئے ہم ان کا تجزیہ کرنا ضروری سمجھتے ہیں ہم نے اوپر جو اقتباسات پیش کئے ہیں ان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ تذکرہ نگاروں کا ایک گروہ ولی کو گجراتی کہتا ہے اور دوسرا گروہ وہ ہے جو ولی کو نہ گجراتی کہتا ہے اور نہ اورنگ آبادی۔ اس کے وطن کے لئے انہوں نے لفظ دکن استعمال کیا ہے۔ اور دو تذکرہ نگار ایسے ہیں جو ولی کو اورنگ آبادی قرار دیتے ہیں۔ اس بات کی توضیح کے لئے یہ جاننا بہت ضروری ہے کہ لفظ "دکن" کا کس خطۂ خاک پر اطلاق ہوتا ہے۔

قدما نے لفظ دکن کا اطلاق جس حصہ ملک پر کیا ہے وہ محض اورنگ آباد

یا بیجاپور نہیں ہے بلکہ دریائے نربدا کے اس کنارے سے مع سلسلہ کوہ ست پڑا، راس کماری تک کی زمین اس میں شامل ہے، اس خطّہ میں گجرات و خاندیش بھی شامل ہیں۔ اس سلسلہ میں یہ بات بھی غور طلب ہے کہ دکن کا لفظ دو معنوں میں استعمال ہوتا ہے شمالی ہند کا کوئی شخص لفظ دکن استعمال کرتا ہے تو دکن سے فقط مملکت آصفیہ کا علاقہ مراد نہیں لیتا بلکہ اس کے تصوّر میں دکن سے مراد ست پڑا سے راس کماری تک کا علاقہ ہوتا ہے (جیسا کہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں) لیکن جب دکن کے اس وسیع علاقہ میں اس لفظ کا استعمال ہوتا ہے تو اس سے مراد گجرات اور برار چھوڑ کر باقی علاقہ ہوتا ہے اس امر سے ہر شخص واقف ہوگا کہ بمبئی بلکہ پورے گجرات، کاٹھیاواڑ، نیز دکن میں شمالی ہند کے تمام باشندے 'ہندوستانی' کے نام سے یاد کئے جاتے ہیں خواہ وہ دہلوی ہوں بنارسی ہوں یا بہاری لیکن یہی لوگ شمالی ہند میں ہوتے ہیں تو دہلوی، بنارسی، بہاری وغیرہ کہلاتے ہیں۔ لکھنؤ والے بہاریوں کو پوربی کہتے ہیں لیکن میر صاحب ادھا لکھنؤ کے رہنے والوں کو 'پورب کے ساکنو' کے نام سے یاد کرتے ہیں میر صاحب ایک جگہ لکھتے ہیں ؎

کچھ ہند ہی میں میرؔ نہیں لوگ حبیب چاک
ہے میرے ریختوں کا دوانا دکن تمام

اِس شعر میں میر صاحب نے پورے شمالی ہند کے لئے لفظ 'ہند' استعمال کیا ہے اور گجرات و دکن کے خطّے کو دکن لکھا ہے۔ مرزا غالب ایک خط میں منشی میاں داد خاں سیاح متوطن سورت کو تذکیر و تانیث کے سلسلہ میں لکھتے ہیں "بھائی ہم نے تم کو یہ نہیں کہا کہ تم مرزا رجب علی بیگ کے شاگرد ہو جاؤ اور اپنا کلام ان کو دکھاؤ ہم نے یہ کہا ہے کہ

تذکیر و تانیث ان سے پوچھ لیا کرو۔ دکھن اور بنگالے کے رہنے والوں کو اس امر خاص میں دلّی لکھنؤ کے رہنے والوں کا تتبع ضروری ہے۔"

مندرجہ بالا اقتباس میں بھی دکھن کا لفظ گجرات و دکن کے پورے علاقہ کے لئے استعمال کیا گیا ہے۔

گجرات کے شعرائے متاخرین میں سے ایک شاعر متخلص علوی نے بھی لفظ ہند شمالی ہند کے لئے اس طرح استعمال کیا ہے۔

اہل سخن یہاں کے بھی سحر البیان ہیں ... موتی نہیں اگلتے ہیں کچھ شاعران ہند

میر حسن دہلوی ولی کو گجراتی کہتے ہیں لیکن یہ فقرہ بھی قابل غور ہے:۔

"چوں دکھنی است اکثر بزبان خود حرف زدہ است"۔

آزاد بھی گجرات کو دکن ہی میں شامل کرتے ہیں۔ آب حیات میں ایک جگہ تذکرۂ فائق کا حوالہ دیتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

"دیکھو تذکرۂ فائق کہ خاص شعرائے دکن کے حال میں ہے۔ اور وہیں تصنیف ہوا ہے۔"

مصنف مخزن شعرا سید نور الدین قاضی شہر بھروچ کے قاضی القضاۃ کے عہدہ پر فائز تھے اور خود تذکرہ بھی خاص گجرات کے شعرا کا تذکرہ ہے۔

موجودہ زمانہ میں بھی شمالی اور جنوبی ہند کی تخصیص کے خیال سے گجرات کو دکن ہی میں شمار کرتے ہیں۔ مولوی عبد الحق صاحب نے انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کے مقالہ اردو میں اس طرح لکھا ہے:۔ دکن میں اردو زبان کے تین بڑے مرکز تھے (۱) گولکنڈہ شاہان قطب شاہی کا دار الخلافہ (۲) بیجاپور شاہان عادل شاہی کا پایۂ تخت (۳) احمد آباد (گجرات)

نواب ابراہیم خان نے گلزار ابراہیمی میں یہ لکھ کر کہ ولی گجراتی ہے
اس کے بعد ہی لکھ دیا ہے کہ

"در شعرائے دکن مشہور و ممتاز است"

عہد سلطان محمود بیگڑا کے مورخ صدر جہاں طبقات محمود شاہی کے
آخر میں یہ الفاظ درج کرتے ہیں: "دار الملک دکن محمد آباد (چانپانیر) گجرات"

اس سے یہ مراد نہیں ہے کہ ولی دکن کے شعرا میں مشہور ہے اور
گجرات کے شعرا میں نہیں۔

اس بات کی تحقیق کے بعد کہ لفظ دکن سے کون سا علاقہ مراد لیا گیا ہے
ان تذکروں کے بیانات پر غور کیجیے جن میں ولی کو اورنگ آبادی لکھا ہے اس
کے باوجود گردیزی ولی کو اورنگ آبادی نہیں لکھتا بلکہ "در دکن چہرۂ ہستی
افروختہ" یہاں گردیزی لفظ دکن کو اس کے وسیع معنوں میں استعمال کرتا
ہے اس کا بڑا ثبوت یہ ہے کہ گردیزی شاہ تجرد کے سلسلہ میں لکھتا ہے "تجرد
شاگرد عزلت زادگاہش دکن است" تجرد شاگرد عزلت سورت کے باشندہ
تھے۔ اس کو گردیزی کی لاعلمی پر محمول نہیں کیا جا سکتا۔ اب میر صاحب کے بیان کو
دیکھیے کہ ولی کو اورنگ آبادی تو کہہ دیا لیکن ساتھ ہی یہ کہہ کر دامن بچا گئے کہ

"احوالش کما ینبغی معلوم من نیست"

البتہ شفیق کا بیان واضح اور غیر مبہم ہے لیکن اس نے اپنے بیان کی تائید
میں کوئی دلیل پیش نہیں کی۔ اس کے علاوہ حمید خاں جنہیں شفیق کی طرح اورنگ آبادی
ہونے کا فخر حاصل ہے بہت واضح طریق پر ولی کو احمد آباد گجرات کا بتاتے ہیں۔ اسی
طرح قدرت اللہ قاسم کا "از سکنۂ دیار دکن" کہنا بھی ولی کو دکنی یا اورنگ آبادی

ثابت نہیں کرتا۔

ولی نے بھی لفظ دکن کو دو معنوں میں استعمال کیا ہے جس شعر میں صرف مملکت آصفیہ مراد ہے وہ یہ ہے:۔ دکھن میں تیرے شعر سن سوتی ہوئے تیرے ولی
جس کے لگیا ہے دل کے تئیں خوش شعر تجھ دلوان کا

شعر کا مطلب یہ ہے کہ اے ولی اہل دکن تیرے اشعار کے مشتاق ہیں اور انہیں تیرے دیوان کا چسکا پڑا ہوا ہے؛ اگر ولی کا وطن دکن (اورنگ آباد) ہوتا تو اس طرح فخریہ اظہار نہ کرتا اپنے دل میں ضرور خوش ہوتا محل افتخار تو یہ ہے کہ وطن سے باہر بھی اس کا کلام مقبول ہے۔

مندرجہ ذیل شعر میں لفظ دکن سے مراد ست پڑا سے راس کماری تک کا علاقہ ہے۔

ولی ایران و توران میں ہے مشہور اگرچہ شاعر ملک دکن ہے

آخر میں ڈاکٹر عبدالحق بابائے اردو اور قاضی اختر جوناگڈھی کے بیانات پیش کرتا ہوں جن سے ولی گجراتی اور شمس ولی اللہ اورنگ آبادی کی الگ الگ شخصیتوں کا پتہ چلتا ہے۔

بابائے اردو نے پاکستان کے "دائرہ معارف اسلامیہ اردو" میں ولی پر مضمون تحریر فرمایا ہے اس میں فرماتے ہیں:

"شمس ولی اللہ اورنگ آبادی ایک اور بزرگ ہیں جو اردو کے شاعر تھے۔ ان کا کچھ کلام اور بعض رسائل انڈیا آفس کے کتب خانہ میں موجود ہیں بعض دکنی مصنفین نے ان کو ولی سمجھ لیا ہے۔"

قاضی اختر میاں جوناگڈھی راقم کو ایک خط میں حسب ذیل اطلاع دیتے ہیں:

"انڈیا آفس سے شمس ولی اللہ کا مختصر رسالہ آگیا ہے۔ مائیکرو فلم کا فوٹو اسٹاف نکلوالیا ہے۔ اس کا مطالعہ کر رہا ہوں۔ یہ شمس ولی اللہ شاہ نعمت اللہ ولی کے خاندان سے تھے اور اورنگ آباد کے قادریہ سلسلہ کے بزرگ تھے اردو میں انہوں نے صوفیانہ رنگ میں بہت کچھ لکھا ہے۔ اگر ان کے متعلق دکن کے تذکروں میں کوئی معلومات ملے تو مجھے لکھ بھیجیں۔"

مذکورہ بالا بیانات دیکھنے کے بعد یقین کے ساتھ یہ کہا جا سکتا ہے کہ دو مختلف شخصیتوں کو خلط ملط کر دینے کی وجہ سے ولی کے بارے میں غلط فہمی پیدا ہو گئی ہے۔

فراق گجرات والا قطعہ :- فراق گجرات والے قطعہ سے بعض حضرات یہ استنباط کرتے ہیں کہ ولی کی زندگی کا بیشتر حصہ گجرات میں گذرا اور جب یہ گجرات سے کسی اور جگہ کا سفر کرتا ہے تو گجرات کی دلچسپیوں سے بیتاب ہو کر یہ قطعہ لکھتا ہے جناب سید محمد صاحب ایم اے نے گلشن گفتار کے مقدمہ میں ایک جگہ یہ لکھا ہے :-

"ولی نے اپنی زندگی کا بڑا حصہ گجرات ہی میں بسر کیا وہ احمد آباد میں توطن اختیار کر چکا تھا اور اس کا انتقال بھی وہیں ہوا۔ اپنے اشعار میں اکثر جگہ گجرات کا اس شیفتگی کے ساتھ ذکر کرتا ہے کہ گویا وہ اس کا اصلی وطن تھا۔ کسی سفر میں ایک مثنوی تمام و کمال سورت (گجرات) کے فراق میں لکھی ہے"۔ وغیرہ۔

یہ بھی خیال کیا جاتا ہے کہ ولی بغرض سیر گجرات گیا تھا اور اس کے ثبوت میں قطعہ کا حسب ذیل شعر پیش کیا جاتا ہے :-

اس سیر کے نشے سوں اوّل تر دماغ تھا :: آخر کوں اس فراق میں کھینچا خمار دل

اس قیاس کے حامی لفظ 'سیر' پر اپنے دلائل کی بنیاد رکھتے ہیں اور اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ ولی بغرض سیر و تفریح گجرات گیا تھا۔ اس سلسلہ میں صاحب تذکرۂ شعرائے دکن لکھتے ہیں :-

"سیر کے لفظ سے معلوم ہوتا ہے کہ ولی گجرات میں بطریق سیر آیا تھا نہ کہ وہاں کا متوطن تھا اگر متوطن ہوتا تو ایسا نہ لکھتا۔

احسن مرحوم کا اقتباس سب سے الگ ہے۔ کلیات ولی طبع اوّل میں اس قطعہ کے سلسلے میں فرماتے ہیں :۔

"قیاس ہو سکتا ہے کہ شہر گجرات کے لئے یہ قطعہ کہا گیا ہے جب کہ وہ سید معالی کے ہمراہ صوبہ پنجاب میں سرہند وغیرہ تک گئے ہیں۔"

چوں کہ ولی کو دکنی ثابت کرنے کے لئے من جملہ اور دلائل کے اس قطعہ سے بھی استشہاد کیا جاتا ہے ہم اسے یہاں درج کر دیتے ہیں تاکہ قارئین کو صحیح نتیجہ پر پہنچنے میں آسانی ہو۔

گجرات کے فراق سوں ہے خار خار دل — بے تاب ہے ہنے منیں آتش بہار دل
مرہم نہیں ہے اس کے زخم کا جہاں منیں — شمشیر ہجر سوں جو ہوا ہے فگار دل
اول سوں تھا ضعیف پہ پابستہ سوز ہیں — جیوں بال ہے اگن کے اُپر بے قرار دل
اس سیر کے نشے سوں اول تر دماغ تھا — آخر کوں اس فراق میں کھینچا خمار دل
میرے سنے ہیں آ کے چمن دیکھ عشق کا — ہے جوش خوں سوں تن ہیں مرے لالہ زار دل
حاصل کیا ہوں جگ میں سراپا شکستگی — دیکھا ہے مجھ شکیب سوں صبح بہار دل
ہجرت سوں دوستاں کے ہوا جی مرا گداز — عشرت کے پیرہناں کوں کیا تار تار دل
ہر آشنا کی یاد کی گرمی سوں تن منیں — ہر دم میں بے قرار ہے مثل شرار دل
سب عاشقاں حضور اچھے پاک سرخ رو — اپنا اپس لہو سوں کیا ہے نگار دل
حاصل ہوا ہے مجکوں ثمر مجھ شکستہ سوں — پایا ہے چاک چاک ہو شکل انار دل

مجمر نمن ہوا ہے بدن سوز ہجر سوں　　اسپند کی مثال ہے آتش سوار دل
افسوس ہے تمام کہ آخر کو دوستاں　　اس میکدے سوں اٹھ کے سدہ بسار دل

لیکن ہزار شکر ولی حق کے فیض سوں
پھر اس کے دیکھنے کا ہوا ہے امیدوار دل

شعر ۱ سے ظاہر ہے کہ ولی گجرات سے باہر کسی اور جگہ ہے اور اسے اپنے محبوب گجرات نے بیتاب کر دیا۔ شعر ۲ کی بنا پر لفظ سیر سے یہ خیال کیا جاتا ہے کہ ولی گجرات بغرض سیر و تفریح آیا تھا مگر لفظ دراصل گجرات کی سیر کے لئے استعمال نہیں ہوا بلکہ اس سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ جب ولی باہر گیا ہوگا تو اس جگہ کی سیر و تفریح سے پہلے تو یہ خوش ہوا لیکن بہت جلد اسے اپنا وطن گجرات یاد آگیا جس کے لئے کہتا ہے آخر اس کے فراق نے سیر و تفریح کا نشہ اتار دیا۔ اشعار ۳ اور ۴ ملاحظہ فرمائیے جہاں ولی اپنے دوست احباب کے ہجر میں بیقرار ہے۔ اس کے جو دوست احباب، اعزا و اقارب اور تلامذہ پائے جاتے ہیں وہ سب گجراتی ہیں ۵ سے یہ واضح ہوتا ہے کہ ولی کو سیر و تفریح کے شوق و ذوق نے اکسایا اور وہ چل پڑا لیکن احباب کے فراق میں اس کا دل گداز ہو گیا اور اس سیر و تفریح کا مزہ جاتا رہا۔ مقطع میں ولی اپنے دل کو اس طرح تسکین دیتا ہے کہ اسے اپنے وطن لوٹنے کی امید ہے ولی کے احباب و اقربا اور اس کے علاوہ دوسری تمام وابستگیوں کو دیکھتے ہوئے ولی کا تعلق گجرات سے بطور سیاح کیسے مان سکتے ہیں۔

بزم الموسیٰ کے ایک مضمون نگار جناب مولانا احسن کے خیال سے اختلاف کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

"احسن مارہروی کا قیاس ہے کہ شہر گجرات کے لئے یہ قصیدہ کہا گیا ہے جب کہ وہ سید ابوالمعالی کے ہمراہ صوبہ پنجاب میں سرہند وغیرہ تک گئے ہیں"۔ ہماری رائے اس کے خلاف ہے۔ ولی نے سید ابوالمعالی کے ہمراہ پہلا سفر جوانی کے زمانے میں کیا ہے۔

اول سوں تھا ضعیف پہ پابستہ سوز ہیں جوں بال لے اگن کے اُپر بیقرار دل

اس شعر سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تو بڑھاپے کی بات تھی ولی نے زمانہ شباب میں ایک دور دراز کا سفر حجاز مقدس کا کیا۔ یہ سفر نہ صرف خطرناک تھا بلکہ طویل بھی۔ ولی سے نہ رہا گیا، بے اختیار رو دئے اور فراق گجرات میں مرثیہ پڑھا لیکن حج کی برکت اور فیض حق سے انہیں یقین تھا کہ وہ گجرات واپس ہوں گے۔

لیکن ہزار شکر ولی حق کے فیض سوں پھر اس کے دیکھنے کا ہے امیدوار دل"

مگر یہ خیال صحیح نہیں معلوم ہوتا کیوں کہ شعر میں لفظ ضعیف بڑھاپے کے معنی میں نہیں آیا ہے بلکہ یہاں اس سے مراد عاشق کا خستہ و ضعیف دل ہے اس کے علاوہ یہ سب سے لال حیرت انگیز ہے کہ ولی نے یہ قطعہ سفر حج بیت اللہ کے موقع پر کہا ہو کیوں کہ شعر ۴ میں لفظ سیر استعمال کیا گیا ہے اور سفر حج بیت اللہ کو یقیناً سیر اور تفریح پر محمول نہیں کیا جا سکتا وہ ایک مقدس اور دینی فرض کی ادائگی ہے نہ کہ سیر و تماشا کے لئے کمر ہمت استوار کرنا ہے۔

غرض اس قطعہ کے سرسری مطالعہ سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ ولی گجرات میں بغرض سیر و تفریح نہیں آیا تھا بلکہ گجرات اس کا اصلی وطن تھا اور جب سیر کے خیال سے وہ گجرات سے باہر قدم رکھتا ہے تو چند دن وہ بڑے عیش و آرام

میں بسر کرتا ہے لیکن آخر کار اپنے محبوب وطن اور احباب واقربا کی یاد اُسے بُری طرح ستاتی ہے تو اسی انتہائی عالم کرب والم میں بے اختیار اپنے وطن کی یاد میں درد انگیز احساسات کا اظہار کرتا ہے۔

سیر و سیاحت :- ولی کی سیر و سیاحت کے متعلق بیرونی شہادتوں سے جو کچھ پتہ چلتا ہے اور اس کے کلام سے جو کچھ معلومات حاصل ہوتی ہیں وہ اتنی ناکافی ہیں کہ اس کے زمانہ کا تعین کرنا بہت دشوار نظر آتا ہے۔ اس سلسلہ میں مولانا آزاد فرماتے ہیں :-

"افسوس یہ ہے کہ ہماری زبان کے مورخ اور ہمارے شعرا کے تذکرہ نویسوں نے اس کے ولی اور خدا رسیدہ ثابت کرنے میں تو بڑی عرق ریزی کی لیکن ایسے حال نہ لکھے جس سے اس کے ذاتی خصائل اور حالات مثلاً دنیا داری یا گوشہ گیری۔ اقامت یا سیاحی راہ علم و عمل کی نشیب و فراز کی منزلیں یا اس کی صحبتوں کی مزہ مزہ کی کیفیتیں معلوم ہوں بلکہ برخلاف اس کے سنہ ولادت اور سال فوت تک کبھی نہ بتایا۔"

مولانا احسن کو بھی تذکرہ نویسوں سے یہی شکایت ہے۔

"کسی سیاح شاعر کی سیر و سیاحت ایسی چپ چاپ اور ساکت و صامت نہ ہوگی جیسی ہمارے تذکرہ نویسوں کی غفلتوں سے بیچارے ولی کی دیکھی جاتی ہے۔"

اس صورت میں ہمیں اس کے کلام کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے لیکن اس سے پہلے ہم ولی کی سیاحی کی ان شہادتوں کو دیکھ لیں جن کے متعلق یقین ہے اور اس کے

کلام سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے بلوم ہارٹ نے ولی کے زیارت حرمین شریفین کے متعلق لکھا ہے جناب حسینی پیر صاحب کا یہی خیال ہے کہ ولی ۱۱۱۲ھ میں حرمین شریفین کی زیارت سے مشرف ہوا تھا اس کے کلام سے اس سفر کی تصدیق بھی ہوتی ہے ولی کے کلام میں قصیدہ در مدح بیت الحرام اس امر کا غماز ہے کہ ولی نے اس آستانہ مبارک سے متاثر ہو کر یہ قصیدہ لکھا ہے۔ اس کا ایک شعر ہے :-

خلقت حق میں تو عرفاں کی نظر کھول کے دیکھ
ذرّے ذرّے کے بھیتر یہاں ہے جدا اک عالم

مذکورہ بالا شعر میں لفظ (یہاں) سے ظاہر ہے کہ ولی اس مقام پر بیٹھ کر لکھ رہا ہے اس کا مقطع بھی یہی ظاہر کرتا ہے۔

آگ دوزخ کی اچھے اس پہ قیامت میں حرام — اے (ولی) صدق سوں دیکھا ہے جو کئی بیت حرم

حج بیت اللہ کے سلسلہ میں ولی کا سورت جانا بھی یقینی ہے چوں کہ عہد عالمگیر میں سورت باب مکہ تھا سورت پر اس کی مثنوی سے بھی ظاہر ہے کہ ولی نے اس کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اسے اپنی آنکھ سے بھی دیکھا ہے۔ سورت کے بالاگھاٹ، قلعہ اور تاپتی پر صبح کو تقریباً اشنان سے متاثر ہو کر اپنے تاثرات سپرد قلم کرتا ہے مگر ساتھ ہی آخری شعر میں اپنے اعلیٰ مقصد کی طرف رخش خیال کو موڑ دیتا ہے آخری شعر یہ ہے جس سے مقصود سفر بیت اللہ واضح ہے۔

مہرباں ہو کے اے ساقی کوثر — کرم سوں کشتی مے مجکوں دے بھر
الیس کے لطف سوں کر دے عطا مے — جو اس نشے میں دریا کوں کروں طے
عبث باتاں ہیں بس کر اے ولی تو — نہ کر مقصد سوں اپنے کاہلی تو

اگرچہ ولی کے سفر دہلی سے متعلق اس کے کلام میں کوئی شہادت نہیں پائی جاتی مگر قریب قریب تمام تذکرہ نگار اس امر پر متفق ہیں کہ ولی نے بعہد عالم گیری دہلی کا سفر کیا تھا۔

(۱)۔ نکات الشعرا:۔ گویند کہ در شاہجہاں آباد دہلی نیز آمدہ بود

(۲)۔ مخزن نکات:۔ در سن چہل وچار (چہل وچہار) از جلوس عالم گیر بادشاہ ہمراہ میر ابوالمعالی نام سید پسرے کہ دلش فریفتۂ او بود بجہاں آباد آمد۔

(۳)۔ گلزار ابراہیم:۔ گویند در زمان عالمگیر بادشاہ بہ ہندوستان آمدہ مستفید از شاہ گلشن گردید۔

(۴)۔ آثار الشعراء:۔ ابوالمعالی کے ساتھ دہلی میں آئے اور شاہ سعداللہ گلشن تخلص شاعر زبان فارسی کے مرید اور شاگرد ہوئے۔

(۵)۔ سخن شعرا نساخ:۔ عالم گیر بادشاہ کے عہد میں دہلی میں آئے تھے۔

(۶)۔ آزاد:۔ یہ اپنے وطن سے ابوالمعالی کے ساتھ دلی میں آئے یہاں سعداللہ گلشن کے مرید ہوئے شاید ان سے شعر میں اصلاح لی۔

(۷)۔ بلوم ہارٹ:۔ ابوالمعالی کے ساتھ اورنگ زیب کے عہد ۱۱۱۲ھ (۱۷۰۰ء) میں دہلی گئے۔

مذکورہ بالا بیانات سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ ولی نے عہد عالم گیر میں دہلی کا سفر کیا تھا اور اس کے سنہ کے متعلق قائم اور بلوم ہارٹ کا بیان ہے کہ ولی ۱۱۱۱ھ میں دہلی گیا تھا۔ اب تک یہ خیال کیا جاتا تھا کہ ولی دوسری بار عہد محمد شاہ میں دہلی

گیا تھا۔ آزاد نے یہی لکھا ہے :۔

وہ مع اپنے دیوان کے ۱۷۲۲ء محمد شاہی میں دلی پہونچے۔

مگر ولی کے سنہ وفات کی تحقیق و تعیین کے بعد یہ محل نظر ہے۔ محمد شاہ کا عہد حکومت ۱۷۱۹ء تا ۱۷۴۸ء ہے اور ولی ۱۱۱۹ھ ہجری میں انتقال کرتا ہے۔

حمید اورنگ آبادی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ولی نے برہان پور میں کچھ مدت اقامت کی ہے لکھتا ہے :۔

ولی کا برہان پور جانا ممکن معلوم ہوتا ہے کیونکہ علامہ وجیہ الدین کے خاندان کے بعض لوگ خاندیش اور برہان پور میں جا کر آباد ہو گئے تھے۔ علامہ کے حقیقی بھائی شاہ برہان الدین برہان پور میں سکونت پذیر تھے اور اسی جگہ آسودۂ خاک ہیں۔ آج بھی اس خاندان کے لوگ اس جگہ موجود ہیں۔

ولی کے سفر دکن کے متعلق صاحب مخزن شعرا کا بیان ہے کہ "سالہا پرکھن ہم گذرانید" اس کے سفر دکن میں بھی کچھ شبہ کی گنجائش نہیں اس کا ایک قابل وثوق ثبوت یہ ملتا ہے کہ اس کے خویش و اقارب دکن میں موجود تھے۔ ولی کے عم بزرگوار سید حفیظ اللہ بہت پہلے سے دکن میں سکونت اختیار کر چکے تھے۔ شاہ برہان الدین کے فرزند شاہ ہاشم علوی ۱۰۵۶ھ بیجاپور کے مشاہیر اولیا میں سے تھے ولی کے نسبتی بھائی شیخ فرید عہد عالم گیر میں بمقام اورنگ آباد تھے اور وہیں ۱۱۴۵ھ میں انتقال کیا۔ غرض خاندانی تعلقات کی بنا پر ولی کا دکن جانا قرین قیاس ہے۔

تلمذ :۔ ولی کی تعلیم و تربیت احمد آباد میں ہوئی۔ اس نے علوم عقلی و نقلی میں مولانا شیخ نور الدین سہروردی سے اکتساب کیا۔ مولانا شیخ نور الدین ۱۰ شہر جمادی الاول کو

سنہ ۱۰۶۰ھ میں پیدا ہوئے۔ آپ اتنے ذکی و ذہین تھے کہ سات سال کی عمر میں اپنے والد سے سات روز میں گلستان پڑھ لی۔ آپ نے بعض علوم ظاہری مولانا احمد بن سلیمان سے اور سید محمد ابوالمجد محبوب عالم سے فن قرأت اور علم حدیث حاصل کیا۔ تمام سلسلوں کی اجازت بھی محبوب عالم سے حاصل تھی۔ آپ ڈیڑھ سو سے زائد تصانیف کے مالک ہیں۔ آپ روزانہ ایک ختم قرآن کرتے، ہر شب دو بار صلوٰۃ اللیل ادا کرتے اور ہر بار کروٹ لیتے وقت ایک ہزار بار تہلیل کرتے اور دو ہزار بار درود پڑھتے ۸۵ سال کی عمر سے آخر دم تک اربعین اور اعتکاف قضا نہ ہوئے۔ آپ نے کبھی بیم و زر کو چھوا تک نہیں۔ آپ کے ایک شاگرد و عقیدت مند مولانا اکرم الدین مخاطب بہ شیخ الاسلام خان صدر صوبہ احمد آباد نے آپ کے لئے ایک لاکھ چوبیس ہزار روپیہ خرچ کر کے ایک مسجد و مدرسہ تعمیر کرایا تھا اس مدرسہ کا سنگ بنیاد ۱۱۰۲ھ میں رکھا گیا اور ۱۱۱۱ھ میں یہ تیار ہو گیا اسی مدرسہ "ہدایت بخش" کی تعریف میں ولی نے رسالہ نور المعرفت لکھا ہے۔

مولانا ۱۱۴۳ھ میں زیارت حرمین شریفین کیلئے گئے تھے آپ نے بانوے سال کی عمر میں دوپہر شنبہ کو بتاریخ ۹ شعبان ۱۱۵۵ھ میں انتقال کیا۔ کسی نے تاریخ کہی ہے۔

"وارث اہل بیت" آپ کی اولاد میں پانچ پسر اور تین دختر تھیں جن میں شیخ محمد صالح سب سے بڑے تھے۔

شاعری میں ولی کے استاد شاہ گلشن تھے جیسا کہ میر حسن اور دیگر تذکرہ نگاروں نے اس طرف اشارہ کیا ہے خود ولی بھی نور المعرفت کے اختتام پر اس امر کا اظہار کرتا ہے۔

"مصنف ایں عبارت کہ ہمین شناسہ دارد بزرگان بخطاب ولی سرفراز از بہست و از شاگردی زبدۃ العارفین حضرت شاہ گلشن ممتاز۔"

شیخ سعداللہ دہلوی کا نسب نامہ مشہور صحابی زبیر بن العوام تک پہنچتا ہے
شاہ صاحب شاہ گل سرہندی متخلص وحدت بن شیخ محمد سعید بن شیخ احمد مجدد سرہندی
کے مرید تھے۔ اس نسبت سے انہوں نے تخلص شاہ گلشن اختیار کیا تھا۔ شاہ صاحب
کے خاندان کے ایک بزرگ اسلام خان سلاطین گجرات کے عہد میں وزارت کے
عہدۂ جلیلہ پر فائز تھے۔ اس خاندان کے ایک بزرگ نے برہان پور میں بود و باش
اختیار کی اور آخر میں شاہ صاحب برہان پور چھوڑ کر دہلی میں سکونت پذیر ہوئے۔ سرو آزاد
کا بیان ہے کہ ایک دفعہ سیر و سیاحت کے خیال سے اپنے آبائی وطن احمد آباد میں
بھی آئے تھے۔ شاہ صاحب نے ۱۱۴۲ھ میں انتقال کیا۔ یہ صاحب دیوان تھے۔
ان کے دو شعر سرو آزاد میں دیئے ہیں۔

بچشم خویش نگر سحر سامری این است — نظر بہ آئینہ کن شیشہ و پری این است

کشتم شہید تیغ تغافل کشید نتا — جانم ز دست برد غزالانہ دیدنت

عام طور پر مشہور ہے کہ شاہ صاحب سے ولی کی ملاقات بمقام دہلی ہوئی۔
لیکن شاہ صاحب کی اقامت برہان پور اور سید احمد آباد اور ولی کے قیام برہان پور اور سکونت
احمد آباد کے پیش نظر یہ زیادہ قرین قیاس ہے کہ ولی اور شاہ صاحب کے تعلقات کا
آغاز انہی جائیوں سے کسی ایک جگہ پر ہوا ہوگا۔

احباب و تلامذہ:- ولی کے کلیات میں اس کے چند احباب کا ذکر ملتا ہے۔
ان میں سید ابو المعالی اس کا بہت ہی جاں نثار دوست تھا۔ یہ سفر و حضر میں اس کے
ساتھ رہا ہے۔ بعض تذکرہ نویسوں نے لکھا ہے کہ سید معالی کا سفر دہلی میں ولی کا

ہم رکاب تھا۔ مخزن نکات میں صرف "سید پسرے" لکھا ہے ولی نے سید معالی کا سراپا بھی باندھا ہے۔

کلیات میں ایک نام شمس الدین بھی ملتا ہے۔

ہر طرف جگ میں ہے روشن نام شمس الدین کا
چین میں ہے شور جس کے ابرو ے پر چین کا

جناب حسینی پیر صاحب کا بیان ہے کہ یہ شمس الدین اسی خاندان کے ایک فرد شاہ سراج کے فرزند تھے شاہ سراج ولی کے ہمعصر تھے انکا انتقال ۱۱۱۹ھ میں ہوا۔

ولی نے اپنے اعزا کامل و اکمل کا بھی ایک جگہ ذکر کیا ہے۔

نام تیرا ولی نے اے اکمل — شوق سوں ورد صبح و شام کیا
ولی اس شاہ کامل کی حقیقت جو نہیں سمجھا — وہ ہرگز نہیں سمجھا تمامی مرد اکمل کے

کامل اور اکمل دونوں حقیقی بھائی تھے اور اسی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔

ولی نے محمد مراد فوجدار گودھرا و بڑودہ (گجرات) کا بھی ایک جگہ اس طرح ذکر کیا ہے۔

مقصود دل ہے انکا خیال آ ولی مجھے — جو مجھ زباں کا ورد محمد مراد ہے

اسی طرح بڑی خوبی سے محمد یار خان کا نام بھی لایا ہے۔

کیوں نہ ہوئے عشق سوں آباد یہ ہندوستاں — حسن کی ولی کا صوبہ ہے محمد یار خاں

محمد یار خاں دہلی کا ناظم رہ چکا ہے جناب اختر صاحب کا خیال ہے کہ ولی کے قیام دہلی کے زمانہ میں ان سے ولی کے تعلقات رہے ہوں گے وغیرہ۔

ان کے علاوہ ولی نے اپنے چند ہندو احباب کا بھی ذکر کیا ہے۔ گوبند لال، امرت لال، حکیم داس اور بیر لال کے نام ملتے ہیں۔ ایک غزل کے مطلع میں حکیم داس کی

تعریف اس طرح کرتا ہے ؎

ہے بسکہ آب و رنگ حیا کھیم داس میں　　آتا نہیں کسی کے خیال و قیاس میں

ایک جگہ بیر لال کا ذکر کرتا ہے ؎

دیکھا ہے بیر لال کوں اکرم کے باغ میں　　پہنچی ہے بوے عشق کی اس کے دماغ میں

امرت لال اور گوبند لال کے نام تو مستقل غزلیں کہی ہیں۔

ولی کے شاگرد بہت ہونے چاہئیں مگر صرف اشرف[۱۱۲]، رضی اور ثنا کا پتہ چلتا ہے حمید اورنگ آبادی نے گلشن گفتار میں اشرف کا ذکر کیا ہے سید محمد اشرف نام تھا اور تخلص اشرف، احمد آباد کے رہنے والے تھے۔ یہ صاحب دیوان شاعر گذرے ہیں۔ انہیں شاہ عالم بخاری قدس سرہ سے عقیدتمندی تھی ان کے دیوان کا ایک نسخہ پروفیسر سید نجیب اشرف صاحب ندوی کے کتب خانہ میں موجود ہے اس میں بعض جگہ اشرف شاہی لکھا ہوا ہے۔

ولی نے اشرف کے ایک مصرع کو اس طرح تضمین کیا ہے۔

اشرف کا یو مصرع اولی مجھ کوں ہے دلچسپ　　الفت ہے دل و جان کو میرے پیم نگر سوں

کلام کا رنگ قریب قریب ولی کے رنگ کا سا ہے۔

حمید نے ولی کے دوسرے شاگرد رضی کا بھی ذکر کیا ہے اس کا نام حافظ رضی الدین رضی تخلص تھا۔ رضی کا بہت تھوڑا کلام دستیاب ہوا ہے۔

فائق کے تذکرہ مخزن شعرا سے ولی کے ایک شاگرد ثنا، کا پتہ چلتا ہے۔ شیخ ثناء اللہ ثنا احمد آباد کے شیخ زادوں میں تھا اس نے کسب فیوض مولانا شیخ نور الدین سہروردی سے کیا تھا اور شاعری میں ولی کا شاگرد تھا۔

شفیق نے چمنستان شعرا میں معتبر خان عمر کو ولی کا شاگرد بنایا ہے لیکن اس

کے وطن کے متعلق خاموش ہے۔ میر حسن کے تذکرہ اور مخزن نکات سے ولی کے ایک شاگرد فخری کا پتہ چلتا ہے۔ فخری دکنی تھا۔

معاصرین :- ولی کے ہم عصر شعرا میں سے ولی نے ناصر علی سرہندی، فراقی اور آزاد کا ذکر کیا ہے۔ ناصر علی کا ذکر اس طرح کرتا ہے۔

پڑے سن کر اچھل جیوں مصرعہ برق　　اگر مصرعہ لکھوں ناصر علی کوں

جناب ہاشمی صاحب کا خیال ہے ناصر علی کے شاگرد نے اس کے جواب میں یہ لکھا تھا۔

باعجاز سخن گر اوڑ چلے توں　　نہ پہونچے گا ولی ہرگز علی کوں [۱۴]

فراقی گجرات کا ایک شاعر تھا اس سے ولی کی حریفانہ چشمک رہتی تھی جو اس مصرع سے واضح ہے ؎

ترے اشعار ایسے نیں فراقی　　کہ جیں پر رشک آوے گا ولی کوں

لیکن ولی اپنے حریف کے کمال کی داد دینے میں بھی بخل نہیں کرتا اور فراقی کا مصرع اس طرح تضمین کرتا ہے ؎

ولی مصرعہ فراقی کا پڑھوں تب جبکہ وہ ظالم　　کمر سوں کھینچتا خنجر چڑھاتا آستیں آوے

فراقی کا شعر یہ ہے ؎

فراقی کشتہ ہوں اس آن کا جسدم کہ وہ ظالم　　کمر سوں کھینچتا خنجر چڑھاتا آستیں آوے

ولی نے اپنے ایک دکھنی معاصر فقیر اللہ آزاد کا ذکر کیا ہے ؎

آزاد سے سنیا ہوں یو مصرع مناسب　　جس سے کہ یار ملتا ایسا ہنر نہ آیا

آزاد کا شعر یہ ہے ؎

کوئی کسی ہی فن میں ہم ساتھ بر نہ آیا　　پر جس سے یار ملتا ایسا ہنر نہ آیا

ولی کا ایک ہمعصر شاعر احمد گجراتی تھا۔ حدیقۂ احمدی مخزن نکات اور تذکرۂ

گلزار ابراہیم میں اسے معاصر ولی لکھا ہے۔ شفیق نے صرف قدیم شاعر لکھا ہے میر صاحب نے صرف ایک شعر دیا ہے۔

ولی کے کلام میں ایک جگہ علی رضا کا نام آتا ہے ؎

نقد شاہ نجف ولی اللہ　　پیر کامل علی رضا پایا

شاہ علی رضا سرہندی نے گجرات میں سکونت اختیار کی تھی مجلس حال و قال میں اکثر ان کی آنکھوں سے اشک خونی جاری و ساری رہتے۔ آپ کو خرقۂ خلافت میاں شیخ یحییٰ چشتی سے ملا تھا اور سلسلۂ نقشبندیہ میں ارادت رکھتے تھے۔ دکن کے بعض امراء آپ کے مرید تھے شاہ صاحب نے ۲۱ ذیقعدہ ۱۱۴۲ھ میں انتقال کیا ۱۴ھ

فتوت کے ریاض حسنی میں لکھا ہے کہ ولی کو شاہ علی رضا سے بیعت حاصل تھی۔

"دوست بیعت بجناب حضرت شاہ علی رضا گجراتی قدس سرہ دارد" ۱۵ھ

کسی اور جگہ ولی کے مرشد کے متعلق کوئی شہادت نہیں پائی جاتی اور یہ کہنا مشکل ہے کہ ولی نے شاہ صاحب کے ہاتھ پر بیعت کی تھی یا نہیں ولی کے نام کے سلسلہ میں ہم نے ایک مہر پیش کی ہے جس میں خاک نعلین غوثی محمد ولی اللہ ابن شریف محمد علوی لکھا ہے مگر اس سے یہ یقینی طور پر نہیں کہہ سکتے کہ ولی شطاریہ سلسلہ میں مرید تھا۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مختلف سلسلوں میں مرید ہوا مگر اس امر میں یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

وفات :۔ ولی کے وطن کی طرح اس کے سنہ وفات کے بارے میں بھی اختلاف پایا جاتا ہے چونکہ کسی مصنف یا تذکرہ نویس کے پاس اس سلسلہ میں کوئی قطعی دلیل

نہ تھی اس لئے قیاس آرائی سے کام لیا گیا اگر مولوی سید احمد نے فرہنگ آصفیہ میں ولی کی تاریخ وفات ۱۱۴۱ھ دی تو تذکرہ شعرائے دکن کے مولف نے ۱۱۵۵ھ کو ولی کا سنہ وفات ٹھہرایا چونکہ بعض اہل علم نے "وہ مجلس" ولی کی طرف منسوب کی اس لئے یہ قیاس کیا گیا کہ ولی کم از کم ۱۱۴۱ھ تک زندہ تھا بعض اور حضرات نے اس شعر کی بنا پر

دل و لی کا لے لیا دلی نے چھین
جا کہو کوئی محمد شاہ سوں

یہ استدلال کیا کہ ولی محمد شاہ کے عہد حکومت کے بعد تک ضرور زندہ تھا ان قیاسات کو دیکھ کر حافظ کا مشہور عالم مصرع یاد آجاتا ہے ؎

چوں ندیدند حقیقت رہ افسانہ زدند

خدا بھلا کرے ڈاکٹر عبدالحق صاحب مدظلہ کا جن کو جامع مسجد بمبئی کے کتبخانہ میں ولی کی وفات پر ایک تاریخی قطعہ ملا اور جس کی تائید ہمارے محترم بزرگ جناب سید منظور حسین صاحب علوی المعروف بہ حسینی پیر کے خانگی کتب خانہ سے بھی ہوئی پیر صاحب نے بتلایا کہ اس قطعہ کے مصنف احمد آباد کے مفتی آسن ہیں۔ دوسرے اہل علم یقیناً ڈاکٹر عبدالحق صاحب کے شکر گذار ہوں گے لیکن خدا جانے مولوی یحییٰ نشہا صاحب غازی آبادی نے اپریل ۱۹۳۴ء کے زمانہ کانپور میں عبدالحق صاحب کی تحقیق سے کیوں اختلاف کرتے ہوئے تذکرہ شعرائے دکن کے بیان کو درست ثابت کرنے کی کوشش کی اور اس میں حسب ذیل دلائل پیش کئے :-

(۱)۔ وہ مجلس کا سنہ تصنیف ۱۱۴۱ھ ہے۔

(۲)۔ مولف تذکرہ شعرائے دکن نے ولی کی صحیح تاریخ وفات دی ہے۔

(۳)۔ ۱۱۱۹ھ ولی رام ولی کی تاریخ وفات ہوگی۔

تنہا صاحب کے بیانات کی مدلل تردید پروفیسر محمود شیرانی مرحوم کے ایک شاگرد جناب سردار عبدالحمید نے اورنٹیل کالج میگزین بابت اگست ۱۹۳۴ء میں شائع کی۔

ان کی تنقیحات یہ ہیں :- (۱) صاحب فرہنگ آصفیہ کا دیا ہوا سنہ وفات کسی کو بھی قابل قبول نہیں (۲) صاحب تذکرۂ شعرائے دکن نے بغیر کسی یقین و اذعان کے سنہ وفات دیا ہے :- "کہتے ہیں ۱۱۵۵ھ کے قریب احمد آباد گجرات میں فوت ہوا"۔

سنہ وفات کے بارے میں قوی دلیل کے طور پر 'دہ مجلس' کے سنہ تصنیف کو پیش کیا جاتا ہے احسن مرحوم نے کلیات ولی میں بھی 'دہ مجلس' کے سنہ تصنیف کی شہادت پر ۱۱۵۵ھ کو ولی کی تاریخ وفات قرار دیا۔ مگر 'دہ مجلس' کے حقیقی مصنف کے متعلق تلاش و تحقیق کے بعد یہ قیاس ناقابل قبول ٹھہرا۔ 'دہ مجلس' دکن کے ایک اور ولی کی تصنیف ہے [۱۶]

تنہا صاحب کی دلیل کہ ۱۱۹۰ھ ولی رام کا سنہ وفات اس کے جواب میں جناب سردار عبدالحمید نے ولی رام[۱۷] کا سنہ وفات یہ دیا ہے :-

تاریخ وصال ولی رام صاحب . از جام یقین شدہ مست

سردار صاحب نے جناب تنہا کے اس اقتباس کی تردید میں یہ دلیل بھی پیش کی ہے کہ ولی کے سنہ وفات کا مصرع بادشاہ ولی ساقی کوثر علی ہمسلمانی جذبات کا مظہر ہے۔ جو ایک ہندو شاعر کے سنہ وفات کا مصرع نہیں ہو سکتا۔

اگرچہ ہمارے سامنے ولی کا صحیح سنہ وفات موجود ہے تاہم اس کے زمانۂ حیات کو متعین کرنے کی غرض سے چند بیرونی شہادتوں کی طرف قائمین کرام کی توجہ مبذول کرانا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

حسینی پیر صاحب کے پاس ایک دستاویز ہے جس کا سنہ تحریر ۱۱۰۲ھ ہے اور اس پر ولی کی مہر ثبت ہے۔ اس سے ولی کا ۱۱۰۲ھ تک بقید حیات ہونا ثابت ہے۔ ولی کے رسالہ نور المعرفت کا سنہ تالیف تو متحقق نہ ہو سکا لیکن یہ یقینی ہے کہ رسالہ ۱۱۰۹ھ کے بعد کی تالیف ہے چونکہ رسالہ جس مدرسہ کی تعریف میں لکھا گیا ہے وہ مدرسہ ۱۱۰۲ھ اور ۱۱۱۱ھ کے درمیان تعمیر ہوا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ ۱۱۱۱ھ میں ولی زندہ تھا۔ پنجاب یونی ورسٹی میں دیوان ولی کا ایک نسخہ ہے جسے شہ جلوس محمد شاہی (م ۱۱۳۳ھ) میں شمار اللہ نے لکھا ہے۔ اصل عبارت یہ ہے :-

"دیوان اشعار ولی مسمی سید ولی محمد مرحوم بتاریخ چہاردہم شہر محرم الحرام ۱۱۰۸ھ از جلوس میمنت مانوس محمد شاہ بادشاہ غازی خلد اللہ تعالیٰ ملکہ و سلطانہ روز چہارشنبہ وقت چاشت در بلدہ خیر البلاد احمد آباد حمیت عن الفساد بخط فقیر حقیر اضعف العباد و کلب محبوب سبحانی نمود بے بود ثناء اللہ فانی سمت انجام و صورت اتمام پذیرفت"

مندرجہ بالا اقتباس میں ولی کو مرحوم لکھا ہے لہذا یہ یقینی ہے کہ ولی ۱۱۰۸ھ میں زندہ نہ تھا۔ اس کے سنہ وفات کی بڑی شہادت یہ قطعہ ہے۔

مطلع دیوان عشق سید ارباب دل — والی ملک سخن صاحب عرفان ولی
سال وفاتش خرد از سر الہام گفت — بادشاہ ولی ساقی کوثر علی
۱۱۱۸ھ

آخری مصرع کے اعداد ۱۱۱۸ ہوتے ہیں تاریخ گو نے سر الہام سے تعمیہ کر کے ۱۱۱۹ پورا کیا ہے بمبئی کتب خانہ کا یہ نسخہ دیوان ولی جس پر مندرجہ بالا قطعہ درج ہے ۲۱ سنہ جلوس محمد شاہی (م ۱۱۵۲ھ) میں لکھا گیا ہے اور اس کے مصنف مولانا احسن مفتی ہیں۔ ڈاکٹر عبد الحق صاحب نے رسالہ اردو بابت مارچ ۱۹۳۴ء میں اس

کو شائع کر دیا ہے۔ تنہا صاحب کے جواب میں سردار عبدالحمید نے اس نسخہ کے حوالہ سے ایک یہ بھی دلیل پیش کی ہے کہ جب ولی ۱۱۵۵ھ تک بقید حیات تھا تو ۱۱۵۲ھ میں مفتی احسن نے ولی کی وفات سے تین سال قبل قطعۂ سنہ وفات کیوں کہا؟ اعراس نامہ مطبوعہ پیر صاحب میں ولی کی تاریخ وفات ۱۴ شعبان اور وقت عصر لکھا ہوا ہے لہٰذا اب اس قطعہ اور اعراس نامہ کے پیش نظر یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ ولی نے بتاریخ ۱۴ شعبان بوقت عصر ۱۱۵۲ھ میں وفات پائی اس کے بعد کسی قسم کی قیاس آرائی اور شبہ کے لئے گنجائش نہیں رہتی۔

مدفن:۔ ولی کو اس کے خاندان کے قبرستان 'نیلی گنبد' میں دفن کیا گیا اس قبرستان میں علامہ شاہ وجیہ الدین کے خاندان کے کئی بزرگوں کے مزارات ہیں 'نیلی گنبد' شہر سے کچھ فاصلہ پر بمقام شاہی باغ واقع ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں شاہجہاں کا محل اور مغلوں کے زمانہ کی دوسری عمارتیں اس وقت بھی موجود ہیں۔ ولی کے مزار پر چیچنی کی ٹکڑیاں جڑی ہوئی تھیں اس لئے یہ چیچنی پیر کے نام سے بھی مشہور ہے۔

حواشی

۱؎ شیخ وجیہ الدین احمد العلوی :۔ سلاطین گجرات کے دور عظمت میں آپ کے اجداد ہندوستان میں وارد ہوئے، محمد آباد عرف چانپانیر میں سکونت اختیار کرلی۔ آپ کے بزرگوں کی سلاطین گجرات نے بڑی قدر و منزلت کی۔ علامہ وجیہ الدین قدس سرہٗ محرم ۹۱۰ھ میں محمد آباد میں پیدا ہوئے۔ ۵ سال کی عمر سے ۲۳ سال کی عمر تک حصول علم میں منہمک رہے۔ اور اس کے بعد آخر عمر تک درس و تدریس کا سلسلہ جاری رکھا۔ ہزارہا طالب علم نے آپ سے اکتساب علم کیا۔ آپ نے بہت سی درسی کتابوں کی شرحیں اور حواشی لکھے۔ علوم ظاہری کے ساتھ ساتھ علوم باطنی میں بھی آپ مرتبہ کمال تک پہنچے۔ اگرچہ قادن شطاری سے آپ کو ارادت تھی لیکن تصوف کے مراحل شیخ محمد غوثؒ نے طے کرائے تھے۔ راہِ تصوف میں آپ انھیں کے پیرو تھے۔ ۸۰ سال کی عمر میں ۹۹۰ھ میں بمقام احمد آباد انتقال فرمایا۔ محلہ خان پور میں جس جگہ آپ درس و تدریس میں مشغول رہا کرتے وہیں آپ کی آخری آرام گاہ قرار پائی، آپ کے مرید خاص صادق خاں نے آپ کا مقبرہ تعمیر کرایا اور ایک مدرسہ تعمیر کرایا۔ اسی مدرسہ کے ساتھ دارالاقامہ بھی تھا جہاں دور دراز سے طلبا آتے اور قیام کرتے آپ کی اولاد نے بھی آپ کی سنت کو قائم رکھا اور علم کے چراغ کو روشن رکھا جس سے ہزارہا انسان مستفید ہوتے رہے۔

صفحہ ۶۸-۶۹ (مرآۃ احمدی خاتمہ)، اس خاندان کے بیشمار افراد سورت، خاندیش، برہان پور اور دکن میں جا کر آباد ہو گئے۔ موجودہ زمانہ میں بھی آپ کے خاندان کے لوگوں سے قریب قریب ایک محلہ آباد ہے

۲؎ نسب نامہ مملوکہ حسینی پیر صاحب ۳؎ ہندوستانی جولائی ۱۹۳۲ء صفحہ ۲۲۵ ۴؎ مملوکہ شیخ امین شیخ بہادر۔ حدیقہ احمدی تاریخ ہندوستان ہے اس کی تین ضخیم جلدیں ہیں تیسری جلد میں ایک باب عربی، فارسی اردو کے شعرا سے متعلق ہے جس سوم فصل دوم حصہ سوم صفحہ ۵۰۶-۵۰۷ یورپ میں دکھنی مخطوطات

۸ کلیات ولی میں صرف دو مثنویاں پائی جاتی ہیں۔ کلیات کے مقدمہ میں احسن مرحوم نے مضمون کے لحاظ سے ایک ہی مضمون کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا ہے پہلے حصہ میں مناجات اور حمد و نعت ہے اور دوسرا حصہ شہر سورت سے متعلق ہے۔ مولانا احسن مقدمہ میں مثنویوں کے متعلق رقمطراز ہیں "کہ ممکن ہے کہ حصہ اوّل (دہ مجلس) کا ٹکڑا ہو اور یہ قیاس اسلئے ہوتا ہے کہ مثنوی کی تاریخ اختتام بھی اسی بحر میں کہی گئی ہے نیز اسلوب بیان بتاتا ہے کہ کسی خاص کتاب کی تمہید ہے"۔ اس تحقیق کے بعد کہ دہ مجلس ولی دکھنوری کی تصنیف ہے یہ شبہ دور ہو چکا کہ ولی کی مثنوی (دہ مجلس) کا ٹکڑا ہے مگر اسلوب بیان سے یہ ضرور ظاہر ہوتا ہے کہ مذکورہ مثنوی کسی اور مثنوی کا حصہ ہے۔

۹ مولانا شیخ نورالدین کے بڑے صاحبزادے شیخ محمد صالح عرف پیر بابا مولانا کے جانشین ہوئے آپ بڑے ذکی، اور عالم باعمل تھے شاہزادہ اعظم شاہ نے بعہد صوبیداری آپ سے قرآن کریم سنا خلعت و جاگر عطا کی۔ فرخ سیر اور محمد شاہ کے دور میں انکی طلبی پر دہلی تشریف لے گئے تھے اور عطائے شاہی سے سرفراز ہوئے شاہجہاں آباد میں ۶ جمادی الثانی ۱۱۴۷ھ میں آپ کا وصال ہوا نعش مبارک احمد آباد لائی گئی اور جد بزرگوار شیخ محمود کے مقبرے میں سپرد خاک کی گئی۔ شیخ محمد صالح کے پانچ فرزند بہاء الحق، صدر الحق رکن الحق، رضاء الحق اور فیض الحق تھے مولانا شیخ نورالدین کے دوسرے فرزند قاضی محمد نظام الدین تھے آپ ریاضیات میں ید طولیٰ رکھتے تھے انشا اور شاعری میں ماہر تھے امرائے گجرات کی طرف سے بڑی جاگیریں عطا ہوئی تھیں ۱۱۵۱ھ میں احمد آباد کے قاضی القضاۃ ہوئے ۱۲ ذیقعدہ ۱۱۶۴ھ میں وصال ہوا اور اپنے والد کی خانقاہ میں دفن ہوئے مولانا کے تیسرے فرزند شیخ محمود عرف شیخ بڑا جوان بھی لائق و فائق تھے افسوس کہ عنفوان شباب میں لاولد انتقال کیا چوتھے فرزند شیخ قمر الدین عرف شیخ بزرگ مادرزاد اصم و ابکم تھے خط نسخ و نستعلیق خوب لکھتے تھے۔ بارہا کلام اللہ کتابت فرمایا پانچویں فرزند ابو البصیر بہاؤ الدین صغر سن ہی میں انتقال کر گئے ص ۵۸-۵۷-۵۶ مراۃ احمدی خاتمہ۔

۱۰ مآثر الامرا (جلد ۳)

۱۱ رسالہ مصنف ۔ ۱۲ جناب قاضی احمد میاں صاحب اختر نے اشرف پر ایک مفصل مضمون رسالہ اردو بابت جنوری ۱۹۴۷ء میں سپرد قلم کیا ہے۔

۱۳ مقالات ہاشمی ص ۱۳۵ مگر صاحب تذکرۂ شعرائے دکن کا خیال ہے کہ ولی کے جواب میں افضل خان سرخوش نے ناصر علی کی تعریف میں ایک رباعی لکھی جس کا ایک مصرع ولی کے شعر کا جواب ہے۔ مصرع ؎

باشعر علی نمی رسد شعر ولی مذکورۂ بالا شعر دراصل عزیز دکھنی کا ہے۔ تذکرہ محبوب الزمن ص ۱۴ (ج ۲)

۱۴ مرآۃ احمدی خاتمہ صفحہ ۷۰ ۱۵ بحوالہ مقالات نصیر الدین ہاشمی ص ۴۲۵

(صفحہ ۷۹) ۱۶ وہ مجلس کا مصنف ویلور کا باشندہ محمد فیاض متخلص ولی ہے اس نے ملا حسین واعظ کاشفی کی روضۃ الشہدا کو اردو میں منظوم کیا۔ چونکہ اس میں ہر باب کے لیے ایک مجلس لکھا ہے اور اسنے دس باب ہیں اسلئے وہ مجلس بھی کہتے ہیں۔ اس مثنوی کا ہمارے ولی سے کوئی تعلق نہ ہونیکی طرف سب سے قدیم حوالہ غلام محمد منظور کا مرتب کردہ دیوان ولی ۱۲۹۰ھ میں ملتا ہے منظور ولی کو اہل سنت والجماعت ثابت کرنے کی غرض سے یہ عبارت لکھتا ہے :۔

یہ بھی محتجب نہ رہے کہ اس بندر معمورہ بمبئی کے قریب ملک دکن میں ولی محمد نام ولی تخلص کا ایک شاعر زمانۂ پارسین میں گذرا ہے جس نے روضۃ الشہدا کا احوال ہندی میں منظوم کیا ہے وہ غیر ذالک ہے یہ ولی نہیں..... یہ شخص طاہر دکھنی کا جو کہ فارسی میں نامی شاعر گذرا ہے ہمعصر تھا مذہب ان دونوں کا، امامیہ تھا..... مصنف اس دیوان کا ولی الدین احمد آبادی اہل سنت والجماعت سے تھا وغیرہ ص ۱۶ دیوان ولی مرتبہ منظور۔ در مطبع حیدری بمبئی۔

ڈاکٹر زور نے اردو شہ پارے میں اس امر پر روشنی ڈالی ہے اور واضح کیا ہے کہ وہ مجلس ولی ویلوری کی تصنیف ہے اس کے سنہ تصنیف میں اختلاف ہے حکیم شمس اللہ صاحب قادری نے اردو قدیم

بیں سنہ تصنیف ۱۱۱۹ھ لکھا ہے صفحہ ۱۰۱ احسن مرحوم نے ۱۱۱۴ھ قرار دیا ہے اور یہ شعر پیش کیا ہے ؎

ہوا ہے ختم جب درد کا حال گیارا سو تھا اکتالیساں سال کہا ہاتف نے یوں تاریخ معقول
ولی کا ہے سخن حق پاس قبول ــــ جناب ہاشمی صاحب نے یورپ میں دکھنی مخطوطات میں یورپ کے
نسخوں کے حوالے سے ۱۱۳۰ھ لکھا ہے۔ ڈاکٹر زور نے اردو شہ پارے میں لکھا ہے کہ مطبوعہ نسخوں میں ۱۱۱۹ھ
ہے اور انڈیا آفس لائبریری کے نسخے میں ۱۱۳۴ھ وہ مجلس کا سنہ تصنیف پایا جاتا ہے صفحہ ۱۴۵

۱۴ ؎ ولی رام ولی پنجاب کا باشندہ تھا۔ اس نے تصوف میں کئی مثنویاں یادگار چھوڑی ہیں بعض طبع
بھی ہو چکی ہیں۔ اس کی ایک مثنوی بحر عرفان گیان پنڈیں گوجرانوالا سے شائع ہوئی ہے اس مثنوی کے
خاتمہ پر اس کا سنہ وفات ملتا ہے۔ (اورنٹیل کالج میگزین اگست ۱۹۴۴ء صفحہ ۱۲۴)

RekhtaDownload.com

ولی کی علمی استعداد

ولی کے بارے میں ہمارا سرمایۂ معلومات محدود ہونے کی وجہ سے اردو کے اس بڑے محسن اور شاعر کی علمی استعداد کے متعلق بعض حلقوں میں شک اور تذبذب کا اظہار کیا گیا ہے۔ کہیں اس کی عربی سے ناواقفیت کا ذکر کیا گیا ہے اور کہیں بعض عروضی مسامحات کی بنا پر اسے عروض کے نکات سے ناآشنا ٹھہرایا گیا ہے۔ شمس العلما آزاد اپنے قابل قدر تذکرہ "آبِ حیات" میں یوں رقمطراز ہیں:۔

"اُن کی علمی تحصیل کا حال ہماری لاعلمی کے اندھیرے میں ہے...
چناں چہ ان کے اشعار سے معلوم ہوگا کہ قواعدِ عروض کی طرح زبانِ عربی سے ناواقف تھے..... یہ سیر کتاب کا شوق اور علما کی صحبت کی برکت ہے۔"

اگرچہ کلیاتِ ولی، کے لائق مرتب احسن مارہروی ولی کے علمی کمالات کے حق میں کوئی یقینی فیصلہ صادر نہیں کر سکے اور مخالفوں کے اعتراض کو ملحوظ رکھتے ہوئے یہ تسلیم کرنے کے لئے تیار ہیں کہ

"ممکن ہے کہ ولی نے عربی میں درسِ نظامیہ پورا نہ کیا ہو اور
بہت ممکن ہے کہ فارسی میں بھی گلستاں و بوستاں کے آگے طغراد

بدر چپاچ کے خارستان میں نہ الجھے ہوں"۔

تاہم ولی کے ذوقِ سلیم اور طبعِ رواں کے قائل ہونے کے ساتھ آزاد کی رائے سے مندرجہ ذیل الفاظ میں اختلاف کا اظہار کرتے ہیں:۔

"مگر یہ کہنا کہ وہ (ولی) عربی و عروض سے ناواقف تھے خلافِ واقعہ ہے ... اسی طرح بعض عربی و فارسی کے الفاظ متحرک کو ساکن اور ساکن کو متحرک لکھ دینے سے ان کی جہالت و ناواقفیت نہیں ثابت ہوتی، سیر و تلاش سے معلوم ہوگا کہ وہ لوگ بھی جن کی مشرقی فضیلت مسلّم تھی (ولی) سے سو برس بعد تک انھی حرکات و سکنات کے عادی رہے ہیں"۔

اس قسم کی مسامحات کی مثالیں اُنہوں نے خانِ آرزو، شاہ حاتم، آبرو، مومن اور آتش کے کلام میں بھی دکھائی ہیں حالاں کہ ان میں سے بعض بزرگوں کی علمی فضیلت مسلّم ہے۔

ڈاکٹر محی الدین قادری زور نے بھی اُردو شہ پارے جلد اوّل میں ولی کی طرف سے اسی قسم کی صفائی پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

جب ہم کلیاتِ ولی پر نظر ڈالتے ہیں تو ایک دوسرا عالم دکھائی دیتا ہے، اگر ایک طرف ہمیں اس کی علمی استعداد کا قائل ہونا پڑتا ہے تو دوسری طرف اساتذۂ فارسی کے کلام سے اس کی کامل واقفیت بھی ایک امرِ واقعی دکھائی دیتی ہے، ان عقلی و نقلی علوم کا آسانی سے اندازہ کیا جا سکتا ہے جن کی طرف ولی کی طبیعت کا میلان تھا، اس کے کلام کے مطالعے سے ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ ولی اپنے زمانہ کے علوم میں کافی دست گاہ رکھتا تھا اور اکثر کتب متداولہ اس کے مطالعے میں رہ چکی تھیں۔ قرآن، تفسیر

فقہ، فلسفہ، ہیئت، معانی اور تصوف سے اس کا لگاؤ ظاہر ہے۔ اس نے کئی جگہ اپنے اشعار میں قرآنی آیات کے ٹکڑے بڑی قابلیت سے کھپائے ہیں، ذیل کی مثالیں دیکھ کر کون کہہ سکتا ہے کہ ولی قرآن کے معنی سے نابلد تھا ؎

سجن کا مکھ منوّر، نور آیت فال مصحف تھا
کہ اہلِ نامراداں پر دعائے ھل اتیٰ حافظ
رات کو آوں اگر تیری گلی میں اے حبیب
زیور لب ذکر سبحان الذّی اسریٰ کروں
چہرۂ گل رنگ و زلف موج زن خونی منیں
آیت جنّات تجری تحتہا الانہار ہے
وہ چہ پامے مطلب راضیۃً مرضیۃً
محض للہ جگ میں جو اعمال پنہانی کرے
تمام پات بسبح بحمدہ کے بہ حکم
زبان حال سوں کرتے ہیں ذکر سبحانی

پیغمبر اسلام صلعم کی شان میں تحسین و تعریف کے پھول برساتے ہوئے وہ حدیثِ نبویؐ کی طرف اشارہ کرتا ہے ؎

زینّوا القرانکم کا گر سُنے داؤد ناد
ہووئے خوش دربار پر ترے خوش الحانی کرے

زلف و رُخ کو لیل و نہار سے تشبیہ دیتے ہوئے واللیل و والضحیٰ کی قسم اور مکھ کو مصحف اور صورت کو فجر سے مشابہ بتلاتے ہوئے والنجم کی قسم کھاتا ہے۔

علامہ جار اللہ زمخشری کی مشہور تفسیر الکشاف اسے اپنی تفسیر غم کے وقت یاد آجاتی ہے، امام فخر الدین رازی کی نکتہ سنجی کے فخر کو بے جا ٹھہراتا ہے۔ مگر ایک غزل کا آغاز اس عربی مصرع سے کرتا ہے ؎

قولوا أحبابنا فأين طريق

یہ سچ ہے کہ ولی کے یہاں عرب شعرا یا ان کے کلام کی طرف اشارے نہیں پائے جاتے پھر بھی ایک جگہ وہ قصیدہ لامیہ کے حفظ کرنے کا ذکر کرتا ہے، عربی زبان میں دو لامیہ قصیدے بہت مشہور ہیں ایک تو شنفری کا لامیۃ العرب اور دوسرا طغرائی کا لامیۃ العجم۔

ولی نے جس انداز سے اپنے کلام میں مکتب و کتاب، درس و تکرار، مدرسہ و معلم، تعلیم و تعلم، جزدان و رواق اور قیل و قال کی طرف اشارہ کیا ہے اس کی بنا پر اگر ہم یہ قیاس کریں کہ اسے مکتب و مدرسے سے بہ حیثیت معلم و متعلم ضرور تعلق رہا ہے تو شاید بے جا نہ ہوگا۔ فلسفہ، نجوم اور منطق کی اصطلاحیں وہ بے تکلفانہ طور پر استعمال کرتا ہے۔ جوہر فرد، تمنع، نظری اور بدیہی سے وہ پوری طرح واقف ہے، خلا کے محال ہونے میں، وہ فلاسفر کا ہم نوا ہے اسی طرح فلک اکبر فلک کے اسرار اور قوس قزح کی بھی اس کو رسائی ہے۔ ایک جگہ اپنی آنکھ کو برج ثور سے تشبیہ دے کر اسے اپنے ماہ رخ محبوب کی منزل قرار دیتا ہے۔

اسے خطاطی میں بھی اچھا خاصا درک حاصل ہے۔ ریحان، ثلث، نسخ، نستعلیق اور کاف کوفی سے اچھی طرح واقف ہے۔ کاتبوں کے سرگروہ یاقوت المستعصمی کا ذکر اس کے یہاں بار بار آتا ہے۔ ایک جگہ میر علی کا بھی ذکر کرتا ہے

اس نام کے دو کاتب مشہور ہیں ایک تو میر علی تبریزی جو امیر تیمور کا ہمعصر ہے۔ اور دوسرے میر علی ہروی جس نے خطاطی میں مولانا زین الدین اور سلطان علی مشہدی سے فیض حاصل کیا تھا اور جسے ابوالفضل اپنی انشا کے دفترِ سوم میں "سرِ دفتر خوش نویسانِ نستعلیق" کہہ کر یاد کرتا ہے۔ فنِ خطاطی میں میر علی کے کمال کا اعتراف دلی کی ذات تک ہی محدود نہیں چنانچہ اس کا ہم عصر محمد افضل سرخوش جو تذکرہ "کلمات الشعرا" کا مولف ہے اپنے دوست ناصر علی سرہندی کی تعریف کرتے ہوئے لکھتا ہے ؎

با شعر علی نمی رسد شعر کسے زاں ساں کہ خط کس بہ خط میر علی

اس کے ہلال ابرو محبوب کی ابرو حسامی کی یاد تازہ کر دیتی ہے جو اصولِ فقہ کی مشہور کتاب ہے اس کا اصلی نام "المنتخب فی اصول المذہب" ہے اور اپنے مصنف حسام الدین اخسیکتی (متوفی ۶۴۴ھ) کے نام کی مناسبت سے الحسامی کے نام سے پکاری جاتی ہے۔ منطق کی مشہور کتاب شرحِ شمسیہ، یا قطبی کا ذکر آتا ہے فن کی حیثیت سے کرتا ہے، دلی اپنے شاہد کے درس کے بعد قطبی اور منہل کے درس کی ضرورت محسوس نہیں کرتا، یہ منہل غالباً المنہل الصافی ہے جو نحو کی کتاب الوافی کی ضخیم شرح ہے، اس شرح پر مولانا نور الدین صدیقی نے بھی حاشیہ لکھا ہے۔ اس شرح کے مصنف بدر الدین محمد بن ابی بکر دمامینی (متوفی ۸۲۸ھ) ہیں جنھیں بانی احمد آباد سلطان احمد شاہ کی فیاضانہ سرپرستی کشاں کشاں مصر سے گجرات میں لائی جہاں ۸۲۰ھ میں کھنبایت میں انہوں نے ابن مالک کی کتاب تسہیل الفوائد کی شرح "تعلیق الفرائد" لکھ کر سلطان احمد شاہ کے نام پر معنون کی۔ اسی مصنف نے ۸۲۴ھ میں نہر والہ پٹن میں

ابنِ ہشام کی 'مغنی الابیب' کی شرح تحفتہ الغریب فی الکلام علی مغنی اللبیب' کے نام سے تین جلدوں میں لکھی۔ المنہل الصافی، ۸۲۵ھ میں مہائم میں تالیف ہوئی اور اس کا مبیضہ اسی سال مولف نے احسن آباد یعنی گل برگہ میں تیار کیا، اس کتاب کا جو نسخہ مکتوبہ ۹۲۳ھ انڈیا آفس لائبریری میں موجود ہے اس کے کاتب شاہ علی جیو گام دھنی کے پوتے سید ابراہیم ہیں۔

طب اور الٰہیات میں بو علی سینا کی 'قانون' اور 'شفا' سے بھی واقف ہے۔

علم حساب میں 'لیلاوتی' ایک مختصر سی کتاب ہے جسے فیضی نے سنسکرت سے فارسی میں منتقل کیا تھا۔ اور جس کے دیباچے میں وہ اکبر پرستی کا یوں ثبوت دیتا ہے ع

اکبر بہ شناس تا خدا بہ شناسی

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب بھی ہمارے شاعر کے مطالعے میں رہی ہے، ایک اور جگہ فائدہ فواد کا ذکر اس کے یہاں پایا جاتا ہے، کوئی تعجب نہ ہوگا اگر شاعر کا یہاں اشارہ حضرت نظام الدین اولیا دہلوی کے ملفوظات کے اس مجموعے کی طرف ہو جسے ان کے مرید باصفا اور مشہور شاعر خواجہ حسن سنجری نے مرتب کیا ہے اور جس کا نام 'فوائد الفواد' ہے شیخ شہاب الدین سہروردی مقتول کی 'حکمتہ الاشراق' سے بھی اگرچہ ہمارا شاعر ناواقف نہیں لیکن جس خاص علم سے اسے والہانہ شیفتگی ہے وہ معانی اور بیان کا علم ہے۔ شاید ولی کی مرغوب ترین کتابیں 'مختصر المعانی' اور 'مطول' رہی ہیں، یہ دونوں 'تلخیص المفتاح' کی شرحیں ہیں جن کے مصنف علامہ سعد الدین مسعود بن عمر تفتازانی (متوفی ۷۹۲ھ) ہیں، 'مطول' کو اتنی مقبولیت حاصل ہوئی کہ اس پر کئی حاشیے لکھے گئے، تلخیص کا موضوع علم معانی، بیان اور بدیع ہے، ولی مختصر 'مطول' کا ذکر بار بار اور مختلف پیرایوں میں کرتا ہے۔

لے ولی اس خط کا حاشیہ اگرچہ مختصر ہے لیکن مطول کے معانی کا پورا مدعا اس سے ظاہر ہوتا ہے، ہر شب معشوق کی زلف سے مطول کی بحث جاری تھی لیکن اس کے دہن کو دیکھ کر سخن مختصر کرنا پڑا۔ محبوب کی زبان سے جو علم معانی کا بیان سنا تو عاشق نے مطول کا پڑھنا مختصر کر دیا۔ سعد الدین (تفتازانی) کا اصلی مقصد زلف بدیعی کا بیان ہے تعجب ہے کہ ابھی تک لوگ مطول کے معانی کو نہیں سمجھے۔

ولی کا معشوق کی زُلف کو مُطول کی درازی سے اور اس کے دہن کی تنگی کو مختصر سے بار بار تشبیہ دینا ظاہر کرتا ہے کہ یہ کتابیں اکثر اس کے زیر مطالعہ رہی ہیں۔ تلخیص کی ایک اور شرح ہے جو مُطول سے بھی زیادہ مفصّل ہونے کے باعث اُطول کہلاتی ہے ہمارا شاعر واقف ہے، اس کے مصنّف ابراہیم بن محمد بن عرب شاہ اسفرائنی متوفی ۹۴۳ھ ہیں۔

کلّیاتِ ولی میں مختلف علوم کی کتابوں کا جس انداز میں ذکر کیا گیا ہے اس سے یہ حقیقت روز روشن کی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ ولی کے علمی میلانات کیا تھے اور اس کی علمی استعداد کس درجے کی تھی۔ کیا کوئی شخص جس نے کلّیاتِ ولی کا مطالعہ بہ امعانِ نظر کیا ہو ولی پر کم علمی کی تہمت گوارا کر سکتا ہے یہی وجہ ہے کہ احسن مرحوم کو تشکک اور تذبذب کے باوجود تذکرۂ محبوب زمن کے مولف کے اس بیان سے اتفاق کرنا پڑا کہ ولی نے مدرسۂ احمد آباد گجرات میں ضرور تحصیل علوم کی اور بہ قدر ضرورت تمام مروّجہ فنون میں کافی دستگاہ بہم پہنچائی۔

شمس العلماء آزاد اور مولوی احسن مارہروی دونوں نے نور المعرفت کا ذکر کیا ہے مگر اس میں سے ایک کو بھی اس کتاب کے دیکھنے کا موقع نہیں ملا۔ آزاد اور ان کی تقلید میں احسن اس کتاب کا موضوع تصوّف اور سلوک بتاتے ہیں حال آں کہ اس

مختصر سے رسالہ کو تصوّف سے دُور کا بھی تعلق نہیں. مولانا نورالدین صدیقی کے شاگرد اور مرید محمد اکرم الدین مخاطب بہ شیخ الاسلام خان صدر صوبہ نے جو کہ مولانا طاہر بخشیؒ کی اولاد میں سے تھا اپنے استاد کے لئے بہت بڑی لاگت سے احمد آباد میں ایک شاندار مدرسہ تعمیر کرایا. اس مدرسہ کا سنگ بنیاد ۱۱۰۲ ہجری میں رکھا گیا ہے لیکن اس کی عمارت کی تکمیل ۱۱۰۹ ہجری میں ہوئی جس کی تاریخ "ھُوَالمسجدُ اُسِّسَ علی التقویٰ من اوّل یوم" سے نکلتی ہے، باقی عمارات ۱۱۱۱ ہجری میں مکمل ہوئیں۔ "مدرسۃ فیھا الھُدیٰ للعالمین" اس کا تاریخی مادہ ہے یہ وسیع اور شاندار مدرسہ جس کے فیض سے ہزاروں تشنگانِ علم سیراب ہوئے آج خود عبرت کی ایک دردناک داستان بنا ہوا ہے۔ ولی نے اپنا رسالہ "نورالمعرفت" اسی مدرسہ ہدایت بخش کی تعریف اور مولانا نورالدین صدیقی اور ان کے صاحب زادے کی مدح میں لکھا ہے۔

اس مختصر رسالے سے جہاں ولی کی انشاء پردازانہ کمال کا سراغ ملتا ہے اس کے تحصیل علم کا حال بھی آشکار ہو جاتا ہے اور علوم متداولہ میں اس کی دسترس کے بارے میں کوئی شبہ نہیں رہ جاتا۔

نور المعرفت

شبہے از شبہا مطالعہ حاشیۂ خیالی[1] می کردم و بمعنے شرح عقائد[2] دل می رسیدم
گاہی مرکب خیال بمنہاج اصول تگاپو می کرد و لمحہ بغواص طبیعت بہ بحر الرائق[3] فروع
غواصی می نمود و فکر کشاف[4] نکات بلاغت بود و اندیشہ مفسر تفسیر فصاحت، عقل کہ
جامع آلہ موزاست ساعتے (بہ) گلشن راز[5] (سیر) می کرد و نحوی از اوقات بہ تہذیب[6]
الاخلاق صرف می نمود۔ دل از معاملات دنیا کہ اطول مطولات[7] است گریزاں (بود و) طبع
بہ خوبیہائے قناعت کہ زبدہ مختصر[8] است آویزاں۔ زباں چون غنچہ مائل درس خموشی

---

[1] تفتازانی کی شرح عقائد پر احمد بن موسیٰ خیالی نے ۷۶۲ھ میں مشہور حاشیہ لکھا اور اسے محمود پاشا کے نام پر معنون کیا [2] نسفی (متوفی ۵۳۷ھ) کی مشہور کتاب عقائد پر تفتازانی نے شرح لکھی [3] قرآن کے مشہور مفسر بیضاوی (متوفی ۶۸۵ھ یا ۶۹۱ھ) نے علم اصول پر ایک کتاب لکھی جس کا پورا نام منہاج الوصول الی علم الاصول ہے اور عبدالرحمان بن حسن الاسنوی (متوفی ۷۷۱ھ) نے منہاج کی شرح لکھی۔ دیکھو انسائیکلوپیڈیا آف اسلام بیضاوی [4] فقہ حنفی پر ابو البرکات نسفی کی کتاب کنز الدقائق ہے۔ اس کی شرحوں میں سے ایک کا نام بحر الرائق ہے اور اس کا مصنف ابن نجیم مصری (متوفی ۹۷۰ھ) ہے [5] کشاف جار اللہ زمخشری کی مشہور تفسیر ہے جسے مصنف کے معتزلہ خیالات ہونے کے باوجود بہت مقبولیت حاصل ہوئی [6] مختصر الوقایہ کی شرح جامع الرموز کے نام سے شمس الدین محمد خراسانی قہستانی نے ۹۷۱ھ میں لکھی [7] محمود شبستری کی فارسی مثنوی [8] تہذیب الاخلاق یا کتاب الطہارہ ابن مسکویہ کی علم اخلاق پر مشہور کتاب ہے [9] تلخیص کی سرخی اصل و مفصل کی طرف اشارہ ہے [10] تلخیص المفتاح کی شرح۔

بود و دهن چوں صدف باسکوت سرگوشی می کرد۔ ناگاہ پیر روشن ضمیر کہ محاسن اخلاق
از رویش (پیدا) (بود) و نقش سعادت از سیمایش ہویدا۔ سرش مخزن اسرار
سورۂ نور و روے نورانیش نور علی نور۔ چوں صبح لباس نورانی در بر پوشیدہ
از در در آمد و بقدوم میمنت لزوم خویش کلبۂ تاریک ما را مشرق الانوار ساخت
و از روئے التفات بہ زبان فصیح و بیان ملیح آغاز نمود کہ اے روشن طبع و دانا
دل باوجود استعداد سخن سازی و قدرت نکتہ پردازی سکوت اختیار کردن
سیاحت ملک ناشکری کردن است و زبان راست بیان را چوں شمع خاموش
گردانیدن بزم ہوش را تاریک ساختن است۔ اولی آنست کہ قلم عطارد رقم
را بروشن بیانی آشنا سازی و روے کاغذ را بخط و خال عبارت زیب و زینت
بخشی بمجرد استماع ایں کلمات چوں برق برجستم و چوں سایہ بپایش افتادم و التماس کردم
کہ سخن از کدام عالم سر کنم و زبان را در وصف کدام بزرگ بہ جنبانم۔ آں بہار طبع
رنگیں خیال غنچۂ دہن را بہ تبسم آوردہ و بشگفتگی تمام فرمود کہ مناسب مردم خدا آگاہ
آنست کہ زبان را بہ ثنائے ہر نا اہل نکشایند و نوک خامہ بہ مدح ہر آلودہ نیالایند
اگر آرزوے کسب سعادت داری گوش ہوش را چار چشم کن و بداں کہ سزاوار
مدح دریں شہر فیض (نگر) کہ مسمی باحمد آباد است۔ شخصے است کہ آفتاب
بیضاوی[1] خواں با ہزاراں زبان خطوط شعاعی در وصفش عاجز است و عقول
عشرہ بایں تاب و توانائی در مدحش قاصر است۔ شمۂ از ہمہ دانی آں زبدۂ
آفاق نوشتن دلیل دانائی است و مختصر از بیان کمالات آں بدیع اخلاق
نگاشتن حجت بینائی۔

---

[1] مشہور تفسیر قرآن

بیت :-

نیابی ہمچو او بے قیل و قالے　　بحق پیوستہ (و) صاحب کمالے
زبان پاک او مفتاح ہر فن　　معانی از بیانش گشتہ روشن

چوں از نام نامیش سوال کردم بانضاح این معنی پرداخت کہ نام مبارکش ہر چند اظہر من الشمس است اما ادب رخصت نمی دہد کہ بتصریح آں پردازم و چوں شمع خود را بہ چرب زبانی انگشت نما سازم۔ گر بگوئی از خود برآیم و در ضمن ثنا ادا نمایم، زبان را بہ چشمہ آفتاب شستہ و شودہ و ایں بیت برجستہ را بہ آواز بلند برخوان۔

بیت :-

زنورش حال دل چون گل عیان است　　زنامش نور دیں پرتو فشان است

چوں باین تعریب نام روشنش سامعہ افروز گشت بے تابانہ از زبان برآمد گوشے کہ باین نام آشنا نہ باشد در عذاب ابدی گرفتار است و (زبانے) کہ باین اسم متحرک نگردد در باغ سخن خار است نکال بزرگی این نام بزرگ بر خود نازمی کند و نازش بجاست زیرا کہ مسمایش ذاتے است کہ (تحریرش) شارح تجریدش[1] سلف است تقریرش سرمشق تفریدش[2] خلف، چوں (آفتاب) بر روشن ضمیری علم است و چوں قطب بگوشہ نشینی ثابت قدم، (توکلش) دست آویز خدا جویاں و ثنایش ورد زباں راست گویاں، دلش آئینۂ نور الٰہی است و سینہ اش مخزن اسرار نامتناہی، صافی ضمیرش حیرت بخش سنجل است و انگشت فکرش عقدہ کشای (ی)، مالا ینحل۔ واقف مواقف[3] طریقت است و

---

[1] تجرید القدوری۔ ابو الحسین احمد بن محمد الحنفی (متوفی ۴۲۸ھ) کی مشہور تالیف۔
[2] تفرید تجرید کا اختصار محمد بن احمد القونوی (متوفی ۷۶۰ھ) نے تیار کیا۔
[3] علم الکلام پر عضد الدین ایجی (متوفی ۷۵۶ھ) کی مشہور کتاب۔

شارح مقاصد[1] حقیقت، شکرش بشکر آل داؤد دمساز و صبرش بصبر ایوب ہمراز۔ کلامش
با کلام کلیم اللہ ہم کلام و مہمان دارش بہ مہمان داری ابراہیم ہم طعام، عصایش ہم دست
عصائے موسیٰ و فقرش ہم کاسۂ فقر عیسیٰ۔ ردایش بر دوش سفیدی صبح صادق [illegible]
و پیراہنش بہ پاکی دامن یوسف مشہور۔ ارباب مراقبہ ہمیشہ پیشش سر بزانوے
خجلت و اصحاب مشاہدہ در حضورش، درس خوان حیرت۔ نقش پایش لوح دیباچہ
توکل و چوب نعلینش (؟) از شاخسار تحمل۔ نظم

ہم عالم و عامل است و عارف ... دانائے عوارف المعارف[2]
آگاہ حقائق فرائد[3] ... مفتاح خزائن عقائد
کشاف غوامض بلاغت ... بنیائے دقائق فصاحت
علمش دریائے است کہ دو عالم (گوشش) (؟) خزیدہ و حلمش کوہے است کہ
از بار گرانش نہ کوہ افلاک خمیدہ، طبعش غواص بحر الرائق[4] است و فکرش مفتاح
کنز الدقائق خورشید کہ بر تخت روان فلک راکب است از جملہ شمسیہ[5] خوانان او و ماہ (کہ)

---

[1] الٰہیات اور عقائد میں علامہ تفتازانی نے اپنی کتاب مختصر کی شرح المقاصد کے نام سے ۷۸۴ھ میں لکھی۔

[2] تصوف میں شیخ شہاب الدین سہروردی کی تصنیف۔

[3] تفتازانی کی شرح عقائد پر کمال الدین محمد ابن ابی شریف مقدسی شافعی کا حاشیہ الفرائد کے نام سے مشہور ہے۔ [4] و [5] پہلے ذکر آچکا ہے۔

[6] علم منطق کا مشہور رسالہ جسے اس کے مصنف نجم الدین قزوینی (متوفی ۶۷۵ھ) نے صاحب دیوان شمس الدین محمد جوینی کے نام سے معنون کیا۔

سلطان ہزاراں ہزار کواکب اسب از زمرۂ الفیہ[1] دانان او۔ رائے فخر رازی در رکاب فکرتش رواں و فکر محقق دوانی (باجنیبت) رالیش دواں۔ نظرش چوں بر مزشناسی پرداختہ اشارات[2] حکمت العین[3] را بہ یک جنبش مژگاں شناختہ۔ از کتاب ہمہ دانیش مثنوی کواکب ورقے است۔ واز دفتر روشن بیانش شمس[4] بازغہ فردے۔

تکلم می کند چوں وقت تدریس — فرستد آفریں از چرخ ادریس

اگر ارسطو ہوش می داشت کمر (بشاگردیش) می بست و اگر بو علی زندہ بود از شاگردانش تکراری می گرفت۔

بہ حق واصل ز خود وارستہ چند — بہ رنگ ذرہ با خورشید پیوند

تجرد پیشگاں بے خودی کیش — ہمہ حق فہم و حق گوے و حق اندیش

نظر پوشیدہ از نفع و ضرر ہا — بہ کسب علم از خود بے خبر ہا

زخشک و تر نظر پوشیدگانند — بہ خشک و تر قناعت کردگانند

---

[1] الفیہ کے نام سے کئی علوم میں کتابیں لکھی گئی ہیں لیکن سب سے زیادہ شہرت اور مقبولیت اس الفیہ کو حاصل ہے جسے ابن مالک (متوفی ۶۷۲ھ) نے علم نحو میں نظم میں لکھا۔

[2] ابن سینا کی کتاب الاشارات والتنبیہات جس پر امام فخر الدین رازی اور محقق طوسی نے شرحیں لکھیں۔

[3] نجم الدین کاتبی قزوینی (متوفی ۶۷۵ھ) کی کتاب الٰہیات و طبیعیات ہیں۔

[4] ہندوستان کے مشہور عالم ملا محمود جون پوری نے فلسفہ میں الحکمۃ البالغہ لکھی اور اس کی شرح شمس بازغہ کے نام سے لکھی، سرشاہ سلیمان جو ایک قانون داں ہونے کے علاوہ نامور ادیب اور ریاضیات کے ماہر تھے، ملا محمود کے خاندان میں سے تھے۔

همه روشن بیان چون نسخهٔ شمع — پریشانی پریشانست ازاں جمع
همه ها مقتدا د پیرو دل — چراغ حجرهٔ شاں پرتو دل

سرآمد شاگردانِ رشیدش والا دست گاهی است که دولتش مصروف ارباب دین است و نعمتش سرمایهٔ اهلِ یقین۔ دلش مشغول بیاد حق است و طبعش رضاجوئے خالق مطلق۔ ارباب دل از کثرت احسانش ممنون اند و زبان آوراں در شکرگزاریش مرہون۔ عقل (روشنش) شمع راہ دانائی است و ہمت بلندش شیفتهٔ حاجت روائی۔ نامهٔ اعمالش بعنوان دیانت مزین است و معنی امانت از کردارش مبرہن۔ و صدر نشین مسند جاہ و جلالست و نور بخش جبههٔ فضل و کمال۔ ہمتش بہ دلجوئی مصروفست و نیتش بحق گوئی معروف۔

شعر

در تزاید وقار جاہش باد — اکرم الاکرمین پناہش باد

یکے از نتائج حسن نیتش مدرسه ایست که عدیلش چوں عدیل کعبه محالست و نظیرش چوں نظیر خورشید خیال۔ یکه تازان میدان دو عالم که حقائق نفوس سه گانه و حالات چہار ارکان عناصر را بہ قوت حواس خمسه دریافته اند و دانایان ہفت اقلیم ششش جہت (؟) که زیر ایں نه کاخ بلند چوں عقول عشره ممتاز اند ہمتائی ایں نمونهٔ ہشت بہشت را ندیده اند و نه شنیده۔ الحق مدرسهٔ جائیست که اگر درشانش لَمْ يُخْلَقْ مِثْلُهَا فِي الْبِلَادِ گویم رواست۔ مسجد مکانیست که اگر در حقش إِرَمَ ذَاتِ الْعِمَادِ، خوانم بجاست۔ حجرہائے جنت نظیرش مطالع خورشید علوم وَرَفَعْنَاهُ مَكَانًا عَلِيًّا، از شان سکانش مفہوم۔ و مدرسانش چوں بتدریس پرداختند حاشیه قدیم را از تازه بیانی جدید ساختند۔ ہر حجره قصریست از قصرہائے بہشت بدولت فِيهَا سُرُرٌ

مَرْفُوْعَہ"، سرفراز و آب دار خانہ جائیست از جاہاے فردوس بہ تر و تازگی اکواب
مَوْضُوْعَہ "ممتاز۔ کدام صبحے است کہ آفتاب بجاروب خطوط شعاعی رفت و روب
نمی کند کدام شامی است کہ ماہتاب بگستردن فرش نورانی روسفید نمی شود و صبحے کہ
دریں مکان ظہور می کند روز عید صائم الدہر است و شامے کہ دراں جا مشک بیز
می نماید شب قدر قائم اللیل از نونہالان مدرسہ نہال یاوریست کہ زیدنش دیدہ را نہال می
کند و در صحن مسجد درخت برنائیست کہ تماشایش نگاہ را زمزمہ می سازد۔

ابیات

چو وصف مدرسہ آمد بہ تحریر — لطافت از سر نو یافت تعمیر
بوصف او چو کردم فکر خود صرف — ز خوبی ناز بر خود می کند حرف
چو آن جائے مصفا یافت بنیاد — فلک گفتا ندارم تا نیش یاد
نہے جاے مصفا و مطہر — سراپا نور چوں خورشید انور
ز بس آنجا است دلہا پرتو افگن — بود بے منت خورشید روشن
بوسعت ہمچو دلہاے طربناک — بصافی چوں ضمیر عاشق پاک
بود ہر حجرہ اش از بسکہ معمور — تواں تعبیر کردن بیت معمور

صحن کہ بدلکشائی منظور نظر ارباب بینش است کمر بقدم بوس سینہ صافاں بستہ
و چمن کہ بخطاب خضر خانی (؟) سبزہ خرمست بچار بالش سبز بختی مربع نشستہ۔ سبزی
اشجار تو تیاے چشم بینش و سرخی گلہاے گلگونہ چہرہ دانش۔ زمرد از سبزہ اش سرسبزی
اخذ نمودہ یاقوت از گلہایش سرخروئی کسب کرد (۵) لعل از ہیبت لالہ اش در حصار
معدن رمیدہ و گوہر از شرم شبنمش در پردہ صدف خزیدہ۔ گلگشت سازاں چمن نگاہ عالمے

عندلیب ایں گلشن زبان شعرا۔ ہر رگ برگش باصد زبان در یاد خداتن دادہ و نافرمانش بفرمان داری خالق ایستادہ۔ ریحان ایں مقام در خوبی از خط خوباں سر مو تفاوت نہ دارد و طرۂ ایں چمن از غایت شادابی بر سرو قامتاں جادارد و ہر گل زمینش چوں زمین شعر دل رباست و ہر جدول آبش چوں جدول کتاب بدل آشنا۔

شعر

زہے گلشن کہ گرآیم بوصفش — بہار افشاں شود کلک سخن کش
کسے کو رنگ دے آں چمن دید — گل عشرت بداماں نگہ چید
نو سیم گر ثنائے سبزۂ نغز — قلم چوں شاخ نرگس می شود سبز

آرزوے نوشتن گل و لالہ بسیار بود اما قلم در محراب دوات بسجدات نیاز ہر مرتبہ سر فرود می آورد بہانگ بلند می گوید کہ وقت تنگ است بکارے مشغول باید شد کہ عاقبت بکار آید بمجرد شنیدن ایں کلمات از کاہلی دست شستم "اِنِّیْ وَجَّهْتُ" بر زبان راندم نیت مدح در دل آوردم و دست بستہ بجانب قبلہ مقصود رجوع نمودم یعنی بوصف مسجدے پرداختم کہ در نزاہت ہمدوش بیت المقدس است و در رفعت ہم جنیب بیت المعمور عمارتش چوں خیمۂ رحمت برافراشتہ در حق مومناں از دو منارہ دست دعا برداشتہ۔ قبہ ہائے سقفش "تَبَارَكَ الَّذِیْ جَعَلَ فِی السَّمَآءِ بُرُوْجًا" مخصوص خود می داند و قنادیلش "وَجَعَلَ فِیْهَا سِرٰجًا وَّقَمَرًا مُّنِیْرًا" در شان خود می خواند۔ زبان فتیلۂ ہر قندیل بخواندن مصباح[1] مشہور است و شعاع روشن بیانش بہ شرح کردن ضو[2] معروف۔

---

[1] ناصر مطرزی (متوفی ۶۱۰ھ) نے عربی گرامر کی ایک کتاب المصباح کے نام سے تصنیف کی۔
[2] الضوء، المصباح کی شرح تاج الدین حسن بن اسفرائینی کی تالیف ہے (در) اضافہ از مرتب۔ اصل (آب حیات، تاریخ)۔ (ابر) اضافہ از مرتب (را) اضافہ از مرتب۔ (نزالی)

ستونش ستون کاخ ایمان است و جدارش پناه اہل ایمان. قبہ اش در منزلت بعرش
دمسازد و منبرش در رتبہ بکرسی ہمراز سقفش کہ (در) بلندی باسقف فلک ہم سری دارد و سائبان
گوشہ نشینان. وحجرہ ہایش کہ آثار برکت از نیک باطنی آنہا ظاہر است مقام عزلت گزینان
رنگ منبرش کہ بسواد دیدہ می نمایند. مومیائے شکستگی دل و شکل محرابش کہ در خوبی طاق ابروئے
باہلال عید مقابل. کتابہ اش از سیمائے لیلۃ القدر مرقوم است و از سواد رقمش (تاریخ آنجیات)
مفہوم ہر خشت فرشش مربع نشین سریر عبادت و ہر سنگ مصلایش آئینہ نقش
سعادت۔ کدام روزیست کہ مصلیان بکثرت سجدات نقش سعادت رسیمائی نکشند و
کدام شامے است کہ ملائکہ از آسمان بشنیدن صدائے حفاظ نمی رسند۔ مؤذنش بر جستہ
موذنش در گوش ملائک جا کردہ و آواز حزین اماش ہوش از دلہائے خلائق بردہ۔

ابیات

چو سر کردم ثنائے مسجد پاک — کہ سقف او رسیدہ تا بافلاک
(جبیں) افروز شد کلک سخن بند — زنقش سجدہ شکر خداوند
زہے عالی مکانی معرفت خیز — برائے حق پرستان شوق انگیز
بود ابروئے ہر طاقش مہ عید — زقندیلش چراغ افروز خورشید
فلک ہرگز نہ بیند صورت شام — سفیدی از گچ او گر کند وام
اگر تعریف حوضش بر نگارم — ہر آبے (؟) شعر گردد آب دارم
کہ گوئی ہست ایں شعر سحابی — زتکرارش نہ گردد طبع آبی
کسے کو تلخ از ایام گردد — خورد زاں چشمہ شیریں کام گردد
برائے غسل اگر دروے در آید — اگر زنگی بود رومی برآمد

چوں ترصدایاں بوصف آں حوض پرداختند آیہ "فِيهِمَا عَيْنَانِ جَارِيَتَانِ" (را)

بر زبان جاری ساختند۔ صورتش آئینہ ایست بے زنگ بپاک مشربی موصوف، وآیش سحاب رحمتی است بجرم شوی معروف خیالش از خود تہی گردیدہ ایست۔

صاحب دوم۔ وفوارہ اش (ابر) نیسانی است بگوہر فشانی علم۔

بیت

ہر حبابش کہ رو نما گردید علینک دیدۂ صفا گردید

نہر پاکش صفت طینتی است دروں یا تسنیمی است "یَشْرَبُ بِهَا الْمُقَرَّبُونَ"

(زلال) زندگی بچشمۂ حیات بخشیدہ، و موجش سلسبیل (دل) در سلسلۂ خود کشیدہ۔

زبس دارد صفا آب زلالش غبار دل تواں شست از خیالش

جماعت خانہ کہ جامع جمیع خوبیہا است جائیست کہ تماشایش خیال لیلیٰ از خاطر مجنوں محو می سازد و دل فرہاد را از دام زلف شیریں برمی آرد۔ اگر چشم تصویر ار جلوہ اش نور پیدا کند رواست و اگر دیدۂ نرگس از فیض جمالش بینا شود بجا است۔

اشعار

خاک پاکش کہ راحت جانست سرمۂ چشم اہل عرفان است

چوں نگہ سوئے سقف او پوید کشتی بحر آسماں گوید

طاقہائے بلندش ابیات بلند دیوان ہلالی[1] و قندیل روشنش مطلع دیوان مشرقی[2] صافی فرشش صافی ذہن شعرای زمانہ و زنجیر قندیلش مصرعہ برجستہ قاسم دیوانہ[3]

نظم

جماعت خانۂ کان فیض پرورد پئے راحت فزائیہا بود فرد

زہے موزوں مکان دل نشین است نظرگاہ فلک فخر زمین است

---

[1] و [2] و [3] فارسی شعرا۔

صفا انگیز ترا ز دیدۂ پاک ندیدہ ثانی او چشم افلاک
ز خوبی ہائے استحکام آں فرد اساس شعر محکم می تواں کرد

دل می خواہد کہ بوصف حمام میل کند و خود را در چشمۂ راحت غوطہ دہد۔

اشعار

بیا اے خامہ سرگرم بیاں شو بمیدان سخن سازی رواں شو
بود ایں جا یکی حمام سنگیں کہ دارد از نمد نوطاس سیمیں
رقم سازی ز صافیہاش باری بشوئی از دلِ غمگیں غباری

زہے حمام پاک مشرب کہ ہر صبح چوں چشمۂ آفتاب رخ بگرم جوشی کشودہ و تفسیر آیہ "اِنْ کُنْتُمْ جُنُبًا فَاطَّهَّرُوا" را بزبان حال ادا نمودہ، سنگ سفیدش بسعادت پابوسی نامہ سفیدان مشہور و سنگ زردش چوں خط طلا سرمایۂ سرور تا بدانش ملیک دیدۂ آفتاب است و حوضش بصافی صاحب آب۔ آب گرمش عرقی است از روے محبوبان غضبناک چکیدہ و آب سردش زلالیست از چشمہ خضر رسیدہ۔

شعر

چشیدہ ہر کہ گرم و سرد دوراں شناسد آب او را راحت جاں

فرزند ارجمند آں مقتدائے خدا آگاہان نونہال گلشن امید است و نخل ریاض جاوید۔ اثر سعادت از ناصیہ اش پیداست و رنگ صلاح[1] از رویش ہویدا۔ حافظ کلام الٰہی است و امیدوار از فضل نامتناہی از دقت فہمش ابن حاجب[2] متحیر و از رسائی

---

[1] یہاں ولی کی مراد غالباً مولانا کے بڑے صاحبزادے شیخ محمد صالح سے ہے۔ ہمارے قیاس کی تائید صلاح کے لفظ سے ہوتی ہے۔

[2] ابن حاجب عثمان بن عمر المالکی (متوفی ۶۴۶ھ) جن کی اصول فقہ میں منتہی السئول اس کا اختصار مختصر المنتہی مشہور ہے۔

طبعش رنگ بوعلی سینا متغیر۔

جز عطارد کرا مجال بود — کہ نویسد بیان فطرتِ او
علم تجوید با ہمہ اوقاف — ورقے از کتاب جودتِ او
بے تامل بذہن می آید — معنیٔ آیت از قرارتِ او
دائما از سحاب فیض الٰہ — باد سرسبز نخل عترتِ او

مصنف ایں عبارت کہ ہمین ثنا پردازی بزرگان بخطاب ولی سرفراز است و از شاگردی زبدۃ العارفین حضرت شاہ گلشن[1] ممتاز امیدوار از فضل بے نیاز است (کہ ایں) ہرزہ گرد ہی کوچہ حق سبحانہ (را) ہوشیار دم و ثابت قدم دارد بحرمت النبی علیہ السلام و آلہ الامجاد۔

---

[1] شیخ سعد اللہ دہلوی ایک درویش شاعر تھے جنھوں نے اپنے لئے تجرّد و توکل کی راہ اختیار کی۔ حضرت مجدد سرہندی کے پوتے شاہ گل کے مرید تھے ان کے ایک جد بزرگ دارا اسلام خان گجرات میں وزارت کے عہدہ پر فائز رہ چکے ہیں۔ جب اکبر نے گجرات کو اپنی روز افزوں سلطنت کا ایک صوبہ بنالیا تو شاہ گلشنؒ کے اسلاف نے احمد آباد چھوڑ کر برہان پور میں قیام کیا۔ شاہ گلشن نے برہان پور کو خیرباد کہا اور دہلی میں اقامت گزیں ہوئے۔ ایک مرتبہ سیر کے ارادے سے نکلے اور اپنے جدی وطن احمد آباد اور دوسرے شہروں کی سیر کے بعد واپس دہلی پہنچے جہاں انھوں نے سنہ ۱۱۴۱ھ میں وفات پائی ایک ضخیم دیوان ان کی یادگار ہے۔ آزاد بلگرامی نے ان کے یہ دو شعر دیئے ہیں ؎

بچشم خویش نگر سحر سامری این است — نظر بہ آئینہ کن شیشہ و پری این است
گشتم شہید تیغ تغافل کشیدنت — جانم ز دست برد غزالاں ندیدنت

سرو آزاد

ولی کے مرغوب فارسی شعرا

اُردو کو فارسی کا جامہ پہنانے میں شمالی ہند والوں نے بہت نمایاں حصہ لیا لیکن اس کا آغاز گجرات و دکن سے ہو چکا تھا۔ ادبی تشکیل کے پہلے دور میں شاہ علی جیو گام دھنی (گجراتی)، متوفی ۹۷۳ھ کی تصانیف میں فارسی الفاظ و محاوروں کے اُردو ترجمے نظر سے گزرتے ہیں جیسے بندے سے باندی۔ نواختن سے نوازنا۔ گوش کردن سے کان دھرنا۔ محبت داشتن سے پیار دھرنا۔ شاہ صاحب نے فارسی اوزان کو بھی اردو میں پہلی بار روشناس کرایا۔ گجرات کے ایک اور بزرگ خوب محمد چشتی متوفی ۱۰۲۳ھ نے بھی اپنے طور پر بیش تر الفاظ فارسی سے لے کر اردو میں کھپا دیئے۔ جیسے غالیچے کو زلیچہ بنا لیا۔ صحیح سے سہی اور جانور سے جناور وغیرہ۔ خوب محمد نے بھی فارسی بحور کو اردو میں رواج دیا۔ ان بزرگ نے بحور کے متعلق (۱) 'چھند چھندراں' نامی ایک رسالہ بھی لکھا اور صنائع بدائع پر بھی اردو میں (۲) 'بھاؤ بھید' نامی ایک رسالہ لکھا اور اس طرح اردو کو فارسی کے بیش بہا ذخیرے سے مالا مال کرنا شروع کیا۔ اسی طرح اردو میں عربی الفاظ بھی لے لئے جیسے معرفت عرفان، ملکوت، سفلی، علوی، واحد، وحدانیت وغیرہ۔

دکن میں گول کنڈہ اور بیجاپور کے سلاطین اہل ذوق تھے۔ ان کے زمانوں

میں بھی ایک طرف بھاشا اور سنسکرت کا زور تھا تو دوسری طرف فارسی سے بھی کام لیا جاتا تھا۔ یہ زمانہ اردو کا ابتدائی دور تھا لہذا کوئی ایک معیار قائم نہ تھا۔ جہاں بھاشا کے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں تو پورے اشعار بھاشا کے نظر آتے ہیں اور جہاں ہندی شعرا نے فارسی کی طرف توجہ کی تو اردو کے پورے پورے شعر بالکل فارسی ہو گئے ہیں۔

سلاطین گجرات و دکن اور صوفیا کے بعد اورنگ زیب کے زمانہ میں ولی کا دور آتا ہے۔ تاریخ ادب اردو میں یہ ایک انقلابی دور ہے۔ اس دور تک گجرات و دکن میں اردو دوسری مقامی زبانوں کے اثرات کے ساتھ بولی اور لکھی جاتی تھی۔ اور ایک قسم کا معیار ضرور مقرر تھا مگر ولی ایک ایسا مصلح شاعر پیدا ہوا جس کی دور بین نگاہ نے زبان و ادب کی مشکلات اور مقامی دشواریوں کو پالیا۔ ان گتھیوں کو سلجھایا اور ایک شاہ راہ قائم کر دی اور اس طرح شمال، گجرات اور دکن کے خفیف فرق کو مٹا کر تینوں جگہ ایک ہی قسم کی ادبی زبان رائج کر دی

وحدتِ لسانی کا قائم کرنا کوئی آسان کام نہ تھا اس کام کو ولی ایسا عالم و فاضل دور بین اور نبض شناس ہی انجام دے سکا جس کی علمی استعداد کا اندازہ اس مضمون سے بہ خوبی ہو جائے گا۔

ولی کی علمی استعداد پر تفصیل سے بحث کریں اس سے قبل مناسب معلوم ہوتا ہے کہ سرسری طور پر ہندوستان میں فارسی کا جائزہ لے لیں۔

ہندوستان میں محمود غزنوی کی فتوحات نے فارسی شعر و ادب کی ترقی کے لئے سازگار فضا پیدا کر دی۔ سلطان کی شاہانہ سرپرستیوں کی بہ دولت شہر غزنی شعرا

علمار کا مرجع بن گیا تھا. محمود کے دربار کا مشہور شاعر فرخی سلطان کی اکثر مہموں میں اس کے ساتھ رہا. جب محمود سوم ناتھ کی فتح کے بعد واپس غزنی کی راہ لیتا ہے تو اسے بعض سخت دشوار گزار راستوں سے گزرنا پڑتا ہے. اس واپسی سفر کی منزلیں متعین کرنا مورخوں کے لئے بہت مشکل کام تھا. خوش قسمتی سے فرخی کے دیوان میں فتح سومناتھ اور سلطان کی واپسی کے متعلق ایک قصیدہ ملتا ہے جس میں فرخی نے نہایت تفصیل سے ان واقعات کا ذکر کیا ہے. ڈاکٹر محمد ناظم پہلے شخص ہیں جنھوں نے اپنی قابلِ قدر کتاب "سلطان محمود آف غزنہ" میں اس قصیدے سے فائدہ اٹھا کر تاریخ کے طالب علموں کی معلومات میں اضافہ کیا ہے. تاریخی اہمیت سے قطع نظر فرخی کے دیوان میں بعض ہندی الفاظ بھی ملتے ہیں. مثلاً گت یعنی کھاٹ یہ لفظ اسی صورت میں بیرونی نے بھی اپنی کتاب الہند میں استعمال کیا ہے. اگرچہ ہندوستان پر محمود غزنوی کے سترہ حملے بہت مشہور ہیں. تاہم یہ واقعہ ہے کہ ان میں سے بعض حملوں کی حقیقت ایک آندھی سے زیادہ نہ تھی. یہ صرف پنجاب کا علاقہ تھا جہاں محمود اور اس کے جانشینوں نے ایک مدت تک حکومت کی اور یہ اُن علم پرست سلطانوں کا فیض تھا کہ لاہور علم و فن کا مرکز بن گیا. اس شہر کی مرکزی حیثیت کا اندازہ بعض نادرِ روزگار ہستیوں سے لگایا جا سکتا ہے جن کی ولادت گاہ ہونے کا شرف لاہور کو حاصل ہے یا جنھوں نے اسے اپنی بود و باش کے لئے پسند کیا. ابوالفرج رونی اور مسعود سعد سلمان کے ہندوستانی ہونے کے بارے میں بعض تذکرہ نگاروں نے تشکک و تذبذب کا اظہار کیا ہے لیکن اہلِ علم کی اکثریت کو انھیں ہندوستانی تسلیم کرنے میں کوئی تامل نہیں. رونی ایک بلند پایہ قصیدہ نگار ہے اور انوری اور عرفی جیسے شاعر اس کی تقلید میں قصیدے

لکھتے ہیں۔ سنائی جن کو مولانا رومیؒ حکیم غزنوی اور فخر العارفین" کے نام سے یاد کرتے ہیں مسعود سعد سلمان کے مداح اور قدر دان ہیں۔ غزنویوں کی بساطِ حکومت اُلٹنے کے بعد محمد غوری اور اس کے غلام قطب الدین ایبک نے ہندوستان میں اسلامی حکومت کی حدود کو وسیع کرنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا اور ان ہی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ دہلی میں مسلمانوں کی مرکزی حکومت قائم ہوگئی۔ قطب الدین کے غلام شمس الدین التمش اور سلطان قباچہ شعر و ادب کے سرپرست اور مربّی تھے۔ اور ان کے دربار میں بڑے بڑے علماء اور شعرا کا مجمع رہتا تھا۔ امیر خسرو سے پہلے جن ہندوستانی شاعروں نے فارسی ادب میں گراں قدر اضافہ کیا ان کے حالات ڈاکٹر اقبال حسین پروفیسر پٹنہ یونیورسٹی نے نہایت کامیابی کے ساتھ اپنی مفید کتاب "ہندوستان کے قدیم فارسی شعرا" میں بیان کئے ہیں لیکن جس نکتہ سنج اور سخن طراز کو طوطیٔ ہند کہلانے کا حق حاصل ہے وہ امیر خسرو کی ذات ہے۔ انھیں خود بھی اس برتری کا پورا احساس تھا چنانچہ ایک جگہ فرماتے ہیں ؎

چو من طوطیٔ ہندم ار راست پرسی　　زمن ہندوی پرس تا نغز گویم

خسرو قصائد میں اکثر خاقانی کا تتبع کرتے ہیں لیکن ان کی شاعرانہ عظمت کا دار و مدار زیادہ تر ان مثنویوں پر ہے جو انہوں نے یا تو خدائے سخن نظامی کے جواب میں لکھیں یا جن میں اپنے زمانے کے بعض واقعات کی جیتی جاگتی تصویر پیش کی مثلاً دول رانی خضر خان اور قران السعدین۔ غزل میں ان کے پانچ دیوان ہیں جب ان کے ابھی تین دیوان ہی مرتب ہو چکے تھے تو انہوں نے غرۃ الکمال کے خاتمے میں نہایت فخریہ لہجے میں اس کا دعویٰ کیا تھا کہ وہ پہلے فارسی شاعر ہیں جسے تین دیوانوں کے مالک ہونے

کا فخر حاصل ہے۔ غزل گوئی میں خسرو کے علاوہ ان کے دوست اور پیر بھائی حسن سجزی بھی بلند مرتبے کے مستحق ہیں۔ ان کی بعض غزلیں سہل ممتنع کا درجہ رکھتی ہیں اور اسی لئے وہ 'سعدیٔ ہندوستان' کے لقب سے ممتاز ہیں۔ بدر چاچ اس زمانے کا مشہور قصیدہ گو شاعر ہے۔ محمد تغلق کے عہد کا ایک شاعر عصامی ہندوستان کی اسلامی حکومت کی تاریخ نظم میں قلمبند کرتا ہے اس کا یہ شاہ نامہ 'فتوح السلاطین' کے نام سے موسوم ہے۔ لودھیوں کے دور حکومت کا سب سے بڑا شاعر جمالی ہے۔ جس کا یہ شعر بہت پسند کیا گیا ہے ؎

موسی ز ہوش رفت بہ یک جلوۂ صفات
تو عین ذات می نگری در تبسمی

بابر کی آمد سے ہندوستان کی تاریخ میں ایک نئے دور کا آغاز ہوتا ہے۔ علم و فن میں تیموری شہزادوں کا ذوق سلیم کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ 'واقعاتِ بابری' کے صفحات اس عالی حوصلہ کشور کشا کی خوش مذاقی کے آئینہ دار ہیں۔ ہمایوں کو نقلی اور عقلی علوم میں پوری دست رس تھی۔ اس کے علمی شوق کا اس بات سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ فوجی مہموں کے دوران میں بھی کتابوں کے مطالعے میں مستغرق رہتا تھا جیسا کہ 'مرآتِ سکندری' کا مصنف اپنے باپ محمد منجھو سے روایت کرتا ہے جو ہمایوں کے قیامِ گجرات کے زمانے میں کتاب داری کے فرائض بجا لاتا تھا۔ یہ سچ ہے کہ اکبر کو اپنے باپ کی طرح علمی تحصیل کا موقع نہ ملا تاہم اس نے اپنی خداداد قابلیت سے ایک ایسے عادلانہ نظام حکومت کی بنیاد رکھی جس سے ہندوستانی تعلیم، معاشرت اور تمدن میں غیر معمولی تغیرات ظہور پذیر ہوئے۔ سولہویں

صدی عیسوی میں اس نے جس وسیع المشربی کا ثبوت دیا وہ دورِ حاضر کی حکمراں قوموں کے لئے بھی باعثِ رشک ہے۔ اس کا عہد حکومت ہندوستان میں فارسی ادب اور فنون کا زرّیں عہد ہے۔ سب علوم وفنون کے نمائندے اس کے دربار کی زینت کا موجب تھے۔ نقاشی، خوش نویسی اور موسیقی کے بڑے بڑے ماہر اپنے اپنے کارناموں سے علم وفن کو مالامال کر رہے تھے۔ ہندوستان میں عقلی علوم کا صحیح فروغ بھی اسی عہد کی یادگار ہے۔ ایران میں صفوی بادشاہوں نے تہذیب وتمدّن کی ترقی میں بڑی فیاضی اور کشادہ دلی سے کام لیا۔ لیکن چوں کہ مذہبی تعصب کی وجہ سے ان کی زیادہ تر توجہ دینی علوم کی اشاعت پر تھی اس لئے شعروادب کے پجاریوں کو اپنے حوصلے کے مطابق ایران میں وسیع میدان میسّر نہ آسکا اور مجبوراً انہیں ہندوستان کا رُخ کرنا پڑا۔ یہاں اکبر کی شاہانہ فیاضیوں نے اُن کا پُرجوش خیر مقدم کیا اور ان کے لئے ایسے مواقع بہم پہنچائے کہ وہ اپنی فطری صلاحیتوں کی نشوونما کامل طور پر کرسکے۔ ان میں سے اکثر کو ہندوستان کی مٹی اس طرح دامن گیر ہوئی کہ وہ یہیں کے ہو کے رہ گئے۔ بعض ایسے احسان ناشناس بھی تھے کہ ہندوستان کی مہمان نوازی کا لُطف اٹھانے کے باوجود بھی اس ملک کو گالیاں دیتے رہے۔ اکبر کی شعروسخن کی سرپرستی کا ایک واضح اور روشن ثبوت اس کا غزالی مشہدی کو ملک الشعرا کے عہدے پر مقرر کرنا ہے۔ غزالی احمد آباد کے مشہور مقام سرکھیج میں مدفون ہے۔ غزالی کی وفات کے بعد فیضی اس منصب پر فائز ہوا۔ اکبر کے علاوہ جن امرا نے شعرا اور علما کی سرپرستی کی ان میں سب سے زیادہ ممتاز حکیم ابوالفتح گیلانی اور عبدالرحیم خان خاناں ہیں۔ مآثرِ رحیمی کے مصنّف کا بیان ہے کہ فیضی اور عرفی کی تازہ گوئی

حکیم ابوالفتح کی تعلیم و تربیت کا فیض ہے۔ خان خانان کی فیاضیوں کی بدولت شعرا اور علما کی ایک بڑی جماعت اس کے گرد جمع ہو گئی تھی۔ مآثر رحیمی کے صفحات اس کی فیاضی کے واقعات سے پُر ہیں۔ اسی طرح صائب کی شاعرانہ ترقی میں ظفر خاں صوبیدار کشمیر کی اصلاح و تربیت کارفرما تھی۔ جہاں گیر اور شاہجہاں کے زمانے میں آملی اور کلیم ملک الشعرائی کے امتیاز کے مالک رہے۔ لیکن اورنگ زیب کا دینی تقشف اس قسم کی چیزیں جاری رکھنے کی اجازت نہ دے سکا اور اس نے یک قلم ملک الشعرا کے عہدے کا خاتمہ کر دیا۔ اس نیک دل شہنشاہ کے زہد خشک کے باوجود شعر و سخن کا ہنگامہ گرم رہا۔ گیارہویں صدی ہجری میں جن شعرا نے ہندوستان میں فارسی زبان میں دادِ سخن دی ان میں سے مشہور و ممتاز شاعر فیضی، نظیری، ملک قمی، ظہوری۔ زلالی، طالب، کلیم، صائب، شیدا، قدسی، شوکت، بخاری۔ ملا طغرا، ناصر علی سرہندی اور بے دل ہیں۔

اُردو کا سب سے پہلا بڑا شاعر ولی گیارہویں صدی کے نصف دوم میں پیدا ہوا۔ اگرچہ اس کی ولادت کی صحیح تاریخ متعین نہیں کی جا سکتی لیکن اس کی تاریخِ وفات کے بارے میں اب کسی قسم کا شبہ نہیں رہا۔

ولی ۱۱۱۹ھ (یا زیادہ صحیح ۱۱۱۸ھ) میں راہی ملک بقا ہوا نہ کہ ۱۱۵۵ھ

میں پیشتر اس کے کہ ہم ولی کے مرغوب فارسی شاعروں کا ذکر کریں اور اس کے کلام پر فارسی شاعری کے اثر کا اندازہ لگائیں یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان خصوصیات کی طرف اشارہ کر دیا جائے جو گیارہویں صدی کے شعرا کے کلام میں عام طور پر پائی جاتی ہیں۔ مولانا شبلی نے 'شعر العجم' کی تیسری جلد کے شروع میں تفصیل وار یہ خصوصیات

گنائی ہیں. یہاں انھی کے خلاصے پر اکتفا کرتے ہیں۔

اگرچہ دوسرے اصناف سخن میں بھی شاعروں نے طبع آزمائی کی لیکن درحقیقت یہ عہد غزل کی ترقی کا عہد ہے، فلسفہ، مثالیہ، تغزل اور مضمون آفرینی کی طرف زیادہ تر توجہ رہی. عرفی نے فلسفہ کی آمیزش کی، میرزا صائب مثالیہ شاعری کے دلدادہ تھے، تغزل جسے غزل کی جان کہیں تو بجا ہے نظیری کے یہاں بہ درجۂ اتم پایا جاتا ہے. مضمون آفرینی کا وصف تمام متاخرین میں کم و بیش موجود ہے۔ اس طرز کو نمایاں کرنے والا جلال اسیر ہے. شوکت بخاری، قاسم دیوانہ وغیرہ نے اس کو ترقی دی اور بے دل اور ناصر علی کی شاعرانہ بزرگی کا دارومدار ہی اس خصوصیت پر ہے۔ قصیدے میں عرفی نے ایک خاص طرز قائم کیا. ظہوری اور طالب آملی نے بھی قصیدے کو ترقی دی. مثنوی متاخرین کی رنگینی کی وجہ سے مثنوی نہ رہی غزل بن گئی. اس عہد کا بہترین مثنوی گو شاعر فیضی ہے. اس زمانے میں رباعی نے فلسفے کے تمام مسائل ادا کر دیئے. سحابی جو اکبر کا ہم عصر تھا اس نے تقریباً ستر ہزار رباعیاں لکھیں۔

مضمون آفرین متاخرین عام طور پر جو بات کہتے ہیں وہ صاف طریق پر نہیں بلکہ پیچیدہ انداز میں کہتے ہیں۔ یہ پیچیدگی مبالغے اور دور از کار استعارات کے لئے ذمے دار ہے. صنعت ایہام کی وبا عالم گیر ہے اور متاخرین کی شاعری کا بڑا حصہ اسی کی نذر ہو گیا ہے۔ اس دور کی ایک بڑی خصوصیت استعارات کی نزاکت اور تشبیہات کی جدت ہے۔ اسی زمانے میں الفاظ کی نئی تراشیں اور نئی نئی ترکیبیں کثرت سے پیدا ہوئیں. عرفی ان نئی ترکیبوں کا بادشاہ ہے۔

ولی کے لئے یہ عام طور پر مشہور ہے کہ اس کے استاد شاہ گلشن (متوفی ۱۱۴۱ھ)

نے اسے مشورہ دیا کہ وہ تمام خیال جو فارسی میں بے کار پڑے ہیں کام میں لائے اس مشورے کی تاریخی اصلیت کچھ ہی ہو لیکن یہ بات کسی دلیل کی محتاج نہیں کہ ولی کے یہاں وہ تمام مضمون، تشبیہیں، ترکیبیں اور استعارے موجود ہیں جو فارسی شعرا کا طغرائے امتیاز ہیں۔ 'نور المعرفت' کے علاوہ جو ولی کی فارسی انشا پردازی کا قابل تعریف نمونہ ہے اور جس میں فارسی اشعار بھی ولی نے اپنے قلم کا نیچہ ہیں اس کا کلیات ہمارے لئے اس معاملے میں بہترین رہ نما ہے۔ مولوی احسن مارہروی نے جہاں ولی کی شاعرانہ خصوصیات سے بحث کی ہے اُنہوں نے فارسی ترکیبوں، تشبیہوں، اور استعارات کا بھی ذکر کیا ہے۔ جو ولی کے کلام میں بہ کثرت پائے جاتے ہیں لیکن تعجب ہے کہ انہوں نے اس بات کا پتہ چلانے کی کوشش نہ کی کہ ولی نے فارسی شعرا کے کلام کا گہرا مطالعہ کیا ہے اور بعض شاعروں سے وہ خاص طور پر متاثر ہے۔ صاحبُ شعر الہند نے پہلی جلد میں بیان کیا ہے کہ ولی نے امیر خسرو اور نظیری کی پیروی کی بلکہ نظیری کا یہ مضمون ؎

نہ چناں گرفتہ ای جا بہ میانِ جانِ شیریں
کہ تواں ترا دجاں را زہم امتیاز کردن

بہ عینہٖ اڑا لیا ہے ؎

ایسا بسا ہے آکر تیرا خیال جیو میں
مشکل ہے جیو سوں تجھ کو اب امتیار کرناں

یوں تو ولی کی ایک پوری غزل فارسی شاعروں کے ناموں سے مملو ہے لیکن زیادہ تر وہ ان شاعروں کا ذکر کرتا ہے جو قصیدے اور غزل کے میدان کے شہ سوار ہیں۔ انوری اور خاقانی کی طرف اس نے بعض بڑے لطیف اشارے کئے ہیں

وہ کہتا ہے کہ معشوق سر سے قدم تک اپنی جھلک میں گویا انوری کا روشن قصیدہ ہے میری طرف سے یہ بات انوری کو کہہ دو کہ ولی ساصاحب سخن جہاں میں پیدا ہوا ہے۔ ولی کا یہ ریختہ اسے جاکر سناؤ جو انوری کے مانند فکرِ روشن رکھتا ہے. خاقانی کی یاد دل سے بھلا دو، ولی کی طرف دیکھو کہ وہ اب اشک انوری ہے۔ انوری ہی پر کیا موقوف ہے خاقانی اور عرفی بھی میرے سخن کے قائل ہیں۔ جب ولی معشوق کی تعریف میں ریختہ پڑھے تو کوئی تعجب نہیں کہ حسانِ عجم (خاقانی) قبر سے اٹھ کر اسے سنے. مجھے یقین ہے کہ اگر انوری و خاقانی میرا یہ رنگین قصیدہ سن پائیں تو ان پر وجد کی کیفیت طاری ہو جائے۔ یہ اشارے صاف صاف اس بات کا پتا دیتے ہیں کہ ولی انوری و خاقانی کے قصائد کو بہ نظرِ استحسان دیکھتا ہے. ان سے بھی بڑھ کر وہ قصیدے کی صنف میں عرفی کا قائل معلوم ہوتا ہے. نہ صرف یہ کہ وہ عرفی کا ذکر کرتا ہے بلکہ اس کی تقلید میں قصیدے لکھتا ہے اپنے ایک قصیدے کے آخر میں جس کا مطلع یہ ہے ؎

ہوا ہے خلق اُپر پھر کے فضلِ سبحانی
کیا ہے ابر نے رحمت سوں گوہر افشانی

وہ عرفی کے اس مصرع کو لوحِ دل پر لکھتا ہے ؎

کہ ایں قصیدہ بیاضی بود نہ دیوانی

ایک اور قصیدے میں جو اس نے حضرت علیؓ کی منقبت میں لکھا ہے اور جس کا مطلع یہ ہے ؎ ہر ایک رنگ میں جو دیکھا ہوں چرخ کے نے رنگ
ہوا ہوں غنچہ صفت جگ کے باغ میں دل تنگ

عرفی کے اس قصیدے کی پیروی کی گئی ہے ؎

تبارک اللہ از آں آسماں شتاب کرنگ
کہ نعل آئینہ رنگش نہ دید رنگ در رنگ

جیسا کہ مولانا شبلی نے کہا ہے کہ "عرفی قصیدے میں ایک خاص طرز کا مالک ہے اور اپنی گوناگوں خوبیوں کی وجہ سے اس کے قصیدے ہندوستان میں بہت مقبول رہے ہیں"۔ غالباً یہ اسی مقبولیت کا نتیجہ ہے کہ ولی عرفی کی پیروی کرتا ہے۔

جہاں تک غزل میں امیر خسرو اور نظیری کے تتبع کا تعلق ہے ہم مولوی عبدالسلام ندوی کی رائے نقل کر چکے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ولی نے امیر خسرو کی اس مشہور غزل کی زمین میں ؎

جاں ز تن بردی و در جانی ہنوز
دردہا دادی و درمانی ہنوز

اپنی یہ غزل لکھی ہے ؎

تو ہے رشکِ ماہِ کنعانی ہنوز
تجھ کوں ہے خباں میں سلطانی ہنوز

امیر خسرو کا یہ شعر زبان زدِ عام ہے ؎

از سرِ بالینِ من برخیز اے ناداں طبیب
دردمندِ عشق را دارو بہ جز دیدار نیست

ولی نے یہی مضمون اس طرح باندھا ہے ؎

مجھ درد پر دوا نہ کرو تم حکیم کا
بن وصل نیں علاج برہ کے سقیم کا

بالکل اسی طرح اس نے خواجہ حافظ کے اس مصرع کو ؏

بہ آب و رنگ و خال و خط چہ حاجت روے زیبارا

اُردو کا جامہ پہنایا ہے۔ ؏

لباسِ خوب کی حاجت نہیں حسن کے سنوارے کو

امیر خسرو کی 'مطلع الانوار' بھی اس کے زیرِ مطالعہ رہی ہے چناں چہ ایک جگہ کہتا ہے کہ ہر جگہ معشوق کے رخسار کو دیکھنا گویا 'مطلع الانوار' کا مطالعہ کرنا ہے۔ نظیری نے چوں کہ احمد آباد ہی میں بود و باش اختیار کر لی تھی اس لئے قدرتی طور پر ولی نظیری کے کلام سے متاثر ہوا ہوگا۔ ایک جگہ اقلیم سخن میں اپنی تاج داری کا ڈنکا بجاتے ہوئے اتنا بھی گوارا نہیں کرتا کہ اس کے سامنے نظیری کا نام لیا جائے۔ نظیری کی ایک غزل کا یہ مشہور شعر ؎

تحقیق حال ما ز نگہ می تواں نمود
حرفے ز حال خویش بہ سیما نوشتہ ایم

ولی اسی قافیہ اور ردیف کی پابندی کرتے ہوئے غزل لکھتا ہے جس کا ایک شعر یہ ہے ؎

پیمبر نے قدم رنجہ کیا میری طرف آج
یہ نقشِ قدم صفحۂ سیما پہ لکھا ہوں

ظاہر ہے کہ مندرجہ بالا غزل نظیری کے تتبع میں لکھی گئی ہے۔

محبوب کے ابرو کی بیت ولی کو ہلالی کا شعر نظر آتا ہے۔ ہلالی مشہور غزل گو ہے اور ایک مثنوی 'شاہ و درویش' کا مصنف جس کے

پلاٹ پر بابر نے اپنی توزک، میں کڑی نکتہ چینی کی ہے۔ اس مثنوی میں بادشاہ معشوق ہے اور درویش عاشق اس سے پہلے جتنی مثنویاں فارسی میں لکھی گئیں ان میں معشوق ہمیشہ عورت ہوتی ہے۔ ہلالی نے اس جادۂ اعتدال سے ہٹ کر ایک بادشاہ کو معشوق بنا دیا ہے جس طرح محبوب کی ابرو ہمارے شاعر کے دل میں ہلالی کی یاد تازہ کر دیتی ہے۔ اسی طرح اس کے لبِ حیات بخش زلالی کو ولی کے سامنے لاکے کھڑا کر دیتے ہیں۔ زلالی تازگی و جدّتِ خیال کے لئے ممتاز ہے۔ اس نے اپنی مشہور مثنوی محمود و ایاز، ۱۰۲۴ھ میں مکمل کی۔ اس کی تاریخ اختتام "الٰہی عاقبت محمود باشد" ہے۔ زلالی ۱۰۳۱ھ میں وفات پاتا ہے۔ ولی زلالی کی مثنوی گوئی کو محبوب کے ہونٹوں کا فیض سمجھتا ہے۔

ابیات صاف و رنگین رکھتا ہے مثنوی میں
تیرے لباں کا گویا شاگرد ہے زلالی

عاشق کی مدِنگاہ ولی کے نزدیک خیالی کے مصرع کی طرح نامحدود ہے اس لئے اس کے معنی کا احاطہ صرف ایک رمزداں ہی کر سکتا ہے۔ یہ مولانا خیالی خواجہ عصمت اللہ بخاری کے شاگرد ہیں۔ اور دولت شاہ اپنے تذکرے میں ان کے پاکیزہ، رواں اور درویشانہ کلام کی تعریف کرتا ہے۔

مولانا جامی نے بہارستان، میں خیالی کے مندرجۂ ذیل شعر نقل کئے ہیں ؎

اے تیر غمت را دلِ عشاق نشانہ
خلقی بہ تو مشغول و تو غائب ز میانہ

گہ معتکفِ دیر م و گہ ساکنِ مسجد
یعنی کہ ترا می طلبم خانہ بہ خانہ

ابوالفضل نے جب کشمیر میں عام عبادت خانہ بنوایا تو اس پر خیالی کے یہ شعر کندہ کرائے

ہم پہلے مشہور رباعی گو شاعر سحابی کا ذکر کرآئے ہیں۔ ولی محبوب کی چار ابرو کو رباعی سے تشبیہ دیتے ہوئے عاشق کی چشم گریاں کے لئے سحابی کا تخلص تجویز کرتا ہے۔ اس قسم کی رعایت لفظی کی مثال ایک اور جگہ بھی پائی جاتی ہے۔ جہاں ولی کا رنگین نغمہ سن کر عراقی عراق میں عرقِ خجالت میں ڈوب گیا ہے۔

عراقی شیخ شہاب الدین سہروردی کے مرید ہیں اور ان کے ارشاد کی تعمیل میں شیخ بہاء الدین زکریا کی خدمت میں ملتان پہنچے۔

مولانا جامی کا ذکر 'کلیات' میں کئی بار آیا ہے اور ایک جگہ تو ولی ساقی کی چشمِ مست دیکھ کر گردنِ مینا کی بیاض پر جامی کا دیوان لکھتا ہے۔

اور دوسری جگہ محبوب کی آنکھوں کی بہارِ نیم خوابی کو دیوانِ جامی سے انتخاب کیا ہوا رنگین مضمون تصور کرتا ہے۔

اپنے کلام کی شہرت کا بلبلِ تبریز (یعنی صائب) کی شہرت سے مقابلہ کرتا ہے۔

ناصر علی سرہندی ولی کے ممتاز معاصرین میں سے ہے اور ۱۱۰۸ھ میں دہلی میں داعی اجل کو لبیک کہتا ہے۔ ولی کو اپنی شاعرانہ برتری کا اس درجہ احساس ہے کہ ایک جگہ وہ ناصر علی کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اگر ناصر علی کو مصرع لکھ بھیجوں تو وہ اسے سن کر برق کے تند مصرع کی طرح اچھل پڑے ؎

پڑے سُن کر اچھل جیوں مصرعِ برق
اگر مصرع لکھوں ناصر علی کوں

فارسی شعر و سخن سے ولی کی دل بستگی ظاہر ہے چناں چہ ایک پوری غزل اس نے فارسی زبان کے شعرا کے لئے وقف کر دی ہے اور انھی کے ناموں کی مناسبت سے اپنے محبوب کے اوصاف بیان کئے ہیں۔

محبوب کا چہرہ مشرقی کے کلام کی طرح تاباں۔ اس کا حُسن انوری کے قصیدے کی طرح بُرّاق جلوہ جمالی کے اشعار کی طرح دل افروز آنکھ جامی کی طرح سرخوش پیشانی فردوسی کی طرح کشادہ اور ابرو ہلالی کی طرح خمیدہ ہے۔ اس کا فہم ریاضی کے مانند تیز ہے۔ شگفتگیٔ طبع کے اعتبار سے وہ گلشن ہے۔ اس کا دل دانا اور فطرت علی (ناصر علی) کی بلند فطرت کے مشابہ ہے، اس کی زبان فصاحت میں فصیحی کی ہم پلہ اور باتیں زلالی کے اشعار کی طرح میٹھی ہیں۔ اس کی نگاہ فیضی و قدسی کے تخیل کے مانند بلند پرواز ہے، طالب آملی اور شیدا کی طرح اس کی سرشت پاکیزہ ہے، اس میں بدر چاچ کا سا کمال اہلی کا سا دل اور غزالی مشہدی کی سی مست آنکھیں ہیں روشن ضمیری میں محبوب امیر خسرو، صائب تبریزی اور شوکت بخاری سے ہم دوش ہے اور اس کی ابرو شاعر کے لئے وصالی کے طغرا کی طرح خوب صورت ہے، چوں کہ دلِ محبوب کے قد و ابرو کا شوقی اور مائل ہے اس لئے اس کا ہر ایک شعر نعمت خانِ عالی کی طرح بلند اور اس کا ہر ایک مصرع خیالی کے مضمون کی طرح ایک خاص کیفیت کا حامل ہے۔

ولی کی یہ غزل اس بات کی واضح دلیل ہے کہ ولی فارسی شعرا کے کلام

سے بہت متاثر ہے اور وہ اکثر انھی کی پیروی پر استاد دکھائی دیتا ہے اگر ان فارسی تشبیہات و استعارات سے قطع نظر بھی کرلیں جو فارسی زبان کا سرمایہ ہیں تو بھی ہمیں بعض جگہ ولی کی طبیعت کا رجحان فارسی میں شعر کہنے کی طرف مائل نظر آتا ہے بعض اوقات بے اختیار فارسی مصرعے اس کی زبانِ قلم پر آجاتے ہیں مثلاً ؎

بس کہ کثرت شد بہ کوے ان صنم
عاشقِ مسکیں کو جا نہیں الغیاث

بوالہوس تقلیدِ عاشق می کند
پہنچتی اس کوں سزا نہیں الغیاث

دین و ایمانم ربودند گل رخاں ؟ (ربودی گل رخا)
دِل کے تئیں رہنے کو جا نہیں الغیاث

ولی کے بعض اشعار ایک آدھ لفظ کی تبدیلی سے فارسی شعر بن جاتے ہیں مثال کے طور پر یہ شعر لیجئے ؎

خوبیٔ اعجازِ حسنِ یار اگر انشا کروں
بے تکلف صفحۂ کاغذ بیدِ بیضا کروں

گر کروں کی جگہ کنم رکھ دیا جائے تو شعر فارسی زبان کی ملک ہو جائے گا۔

ولی کی فارسی دانی کا ایک بیّن ثبوت وہ فارسی محاورے ہیں جن کا ترجمہ وہ جابجا اپنے اشعار میں کرتا ہے اس قسم کے محاوروں کی ایک مختصر فہرست

نذرِ قارئین کی جاتی ہے :—

دِل بستن بہ چیزے — کسی چیز سے دل باندھنا ؎

ولی جن نے نہ باندھیا دِل کوں اپنے تو نہالاں سے
نہ پایا ان نے پھل ہرگز جہاں میں زندگانی کا

خوش آمدن چیزے — کسی چیز کا پسند آنا ؎

نہ جاؤں صحنِ گلشن میں کہ خوش آتا نہیں مجھ کوں
بغیر از ماہ رُو ہرگز تماشا ماہ تابی کا

دم زدن از چیزے — کسی چیز کا دعویٰ کرنا ؎

ہوئی ہے آرسی جوگن ترے مُکھ کے تصوّر میں
بھبھوتی مکھ پہ لیا دم مارتی ہے خاک ساری کا

دامن کسے گرفتن — کسی کے ساتھ چمٹ جانا ؎

مجھے بولیا کہ تو واقف نہیں عشقِ حقیقی سوں
تو بہتر یوں ہے جا دامن پکڑ عشقِ مجازی کا

شیوہ گرفتن — طریقہ اختیار کرنا ؎

کرے تا تجھ پری رُو سے طلب یک بوسہ شیریں
لیا ہے اس سبب دل نے مرے شیوہ گدائی کا

دنبال چیزے گرفتن — کسی چیز کا پیچھا کرنا (لینا) ؎

جہاں جاتا ہوں وہاں آتا ہے سائے کے نمن پیچھے
ترے برہا نے اے ظالم لیا دنبال عاشق کا

روا داشتن چیزے ۔ کسی چیز کو روا سمجھنا ۔

رکھتا ہے کیوں جفا کو مجھ پر روا اے ظالم
محشر میں تجھ سوں میرا آخر حساب ہوگا

آب کردن ۔ پگھلانا، منفعل کرنا ۔

اے ولی دل کوں آب کرتی ہے
نگہ چشم شرم گیں کی ادا

نماز کردن ۔ نماز ادا کرنا، تسلیمات بجالانا ۔

اے قبلہ رو ہمیشہ محراب میں بھواں کی
کرتی ہیں تیری پلکاں مل کر نماز گویا

گرم شدن بازار ۔ بازار کا تیز ہونا ۔

ہوا تجھ غم سے جاری شوق کا طومار ہر جانب
ہوا ہے گرم تیرے عشق کا بازار ہر جانب

عبارت بودن از چیزی ۔ کسی چیز سے مراد لینا ۔

دیکھے سوں مجکوں آج شب و زور نیک ہے
وہ زلف و رُخ کہ جن سے عبارت ہے دن رات

رخت بستن ۔ بوریا بستر باندھنا، چل دینا ۔

مُکھ اُپر تیرے ہے ایسی جھلجھلاٹ
جس کے دیکھے ہوش نے باندھیا ہے رخت

حساب چیزے گرفتن ۔ کسی چیز کی پروا کرنا، کسی چیز سے ڈرنا ۔

ہے جلوہ گر صنم میں بہارِ عتاب آج
لیتا ہے اس کے ناز و ادا کا حساب آج

تماشا کردن ــ دیکھنا ؎

تجھ مُکھ کا نُور جب سوں تماشا کیا ولی
کڑوا لگا ہے جب سے جگت میں مرور صبح

کمر بستن بر چیزے ــ کسی چیز کے لئے مستعد ہونا ؎

آیا جو کمر باندھ کے تُو جور و جفا پر
میں جی کوں تصدّق کیا تجھ بانکی ادا پر

رام شدن ــ تابع ہونا ــ رام کردن ــ گھبرا کر بھاگنا ؎

رام تجھ امر کا ہوا ہے ولی
گر ہے انصاف اس سے رم مت کر

ہمہیز کردن ــ گھوڑے کو ایڑ لگانا ؎

شوخ نکلا جب قدم کو تیز کر
ناز کے شبدیز کو ہمہیز کر

سبز شدن سخن ــ بات کی رسائی ہونا ــ بات کا بر محل ہونا ؎

فصاحت کیا کہوں اس خوش دہن کی
کِسی کا واں نہیں ہوتا سخن سبز

عجب کردن از چیزے ــ کسی چیز پر متعجب ہونا ؎

اس چشمِ اشک بار سوں میری عجب کر
سلنے کا داغ تجکوں دکھایا نہیں ہنوز

لباس در برکردن ۔ کپڑے پہننا ؎

کیا ہوں بریں اپس کے لباس عُریانی
ولی برہ نے دیا یو قبا مجھے تشریف

قول دادن ۔ وعدہ یا اقرار کرنا ؎

قول مجھے دے نہ دے رسمِ وفا ہاتھ سوں
آ ولی سوں مل، نہ مِل غیر سوں شیریں سخن

سازکردن بہ کسے ۔ کسی سے نباہ کرنا، سازگار یا موافق ہونا ؎

شاہد غزل ولی کی لے جا اُسے سُنا دے
اس واسطے بجا ہے مطرب سوں سازکرناں

جاکردن ۔ ٹھیرنا، مقام کرنا ؎

گوہر اس کی نظر میں جا نہ کرے
جن نے دیکھا ہے آب و تابِ سخن

بجا ماندن ۔ ہوش میں رہنا، اپنی جگہ پر قائم رہنا ؎

سخن کوں دیکھ کے دشوار ہے بجا رہنا
نگاہ تیز نگاہاں ہے خار آتشِ حسن

گوش کردن ۔ سننا ؎

یک بار میری بات اگر گوش کرے توں
ملنے کوں رقیباں کے فراموش کرے توں

گو بردن از چیزے ۔ کسی پر سبقت لے جانا ؎

ہیں مغز میں پستے کی نمط تل کے سبب یوں
گویا یہ لباں لے گئے گو تنگ شکر سوں

برسر سخن آمدن ۔ بات شروع کرنا ؎

آوے وہ نو بہار اگر برسر سخن
طوطی کوں لاجواب کرے یک جواب میں

حلِّ عقد شدن ۔ عقدہ حل ہونا ؎

گرہ گرفتن در دل ۔ پیچ و تاب کھانا ؎

نہ ہووے اے ولی حل ہرگز اس کا عقدۂ مشکل
تماشے سوں کہ جن نے دل منیں اپنے گرہ پکڑی

در برکشیدن ۔ بغل گیر ہونا ؎

تیرے اس حسنِ عالم گیر کوں کھینچا اپس برمیں
مگر رکھتی ہے کیا یہ آرسی طالع سکندر کے

قلم شدن ۔ کٹنا ؎

نرگس قلم ہوئی ہے سجن تجھ نین اگے
شکر ڈلی ہے آب میں تیرے بچن اگے

سر کردن چیزے ۔ کسی چیز کو شروع کرنا ؎

جس وقت سر کرو گے بیاں اس کی زلف کا
سودا زدوں پہ غم کے سیاہ روز لاؤ گے

درجانہ گنجیدن ۔ جامے میں نہ سمانا ؎

جیوں گُل شگفتگی سوں جامے میں نہیں سماتا
جب سوں سُنا ولی نے رنگین ادا کی گالی

چیں بر جبیں آوردن ــــ تیوری چڑھانا ؎

عاشق کے دیکھنے سوں لاتا ہے چیں جبیں پر
اے خوش ادا میں خوش ہوں تیری یہ ناخوشی سے

کار فرمودن کسے را ۔ کسی سے کام لینا ؎

غیرت سوں کام فرما نامحرموں سے مت مل
ہے عین مہربانی اس مہرباں کی گالی

چشم داشتن ــ امید رکھنا ؎

چشم رکھتا ہوں اے سجن کہ پڑھوں
تجھ نگہ سوں قصیدۂ جامی

باریافتن ــ بار پانا ؎

ادب کے اہتمام آگے نہ پاوے بار واں ہرگز
تیرے سائے کی پابوسی کو گر رنگِ ایاز آوے

رشک بردن بر کسے ۔ کسی پر رشک کرنا ؎

مجھ حال اُپر ہالۂ ماہ رشک لجاوے
گر خواب میں وہ نوخط شیریں بچن آوے

بر کرسی نشاندن ۔ کسی چیز کو باموقع و بامحل کرنا ؎

ولی ارباب معنی میں اسے ہے عرش کا رتبہ
پری زادانِ معنی کوں جو کُئی کرسی پہ بھلا دے

الفت گرفتن بہ چیزی ۔ کسی سے مانوس ہونا ۔ کسی چیز سے الفت کرنا

غیر سوں الفت پکڑنا ہجر میں درکار نہیں
دم بہ دم آہ دل بے تاب اگر دم سازہے

جفاکشیدن ۔ ظلم سہنا ؎

سدا عاشقاں کھینچتے ہیں جفا
جفا کار ہے گردش افلاک کی

درفرمان کسے شدن ۔ کسی کا تابع ہونا ؎

اپس ناز کے مت ہو فرماں میں
قسم ہے تجھے ایزدِ پاک کی

دل سرد شدن از چیزے ۔ کسی چیز سے اکتا جانا ؎

وہ آبِ خضر سوں دل سرد کیوں نہ ہو دائم
یہ حوضِ پاک سوں جو کُئی کہ آپیا پانی

بتنگ شدن ۔ تنگ ہونا ؎

اے دوستاں بہ تنگ ہوا ہوں میں ہوش سے
پیستم کا تانوں لے کے مجھے بے خبر کرو

بازار کسے سرد کردن ۔ کسی کے بازار کی رونق کم کرنا ؎

اپنے شیریں سخن کو دے کے رواج
سرد بازارِ قند کرتے ہیں

ولی کے کلام میں ہندوستانی عنصر

اِس کتاب کے باب "ولی کی علمی استعداد" اور ولی کے مرغوب فارسی شعرا" سے ولی کے عقیدت مندوں پر واضح ہو چکا ہوگا کہ ولی اپنے زمانے کے علوم میں یدِ طولیٰ رکھتا تھا اور اسی طرح فارسی ادب میں بھی اسے مہارت تامہ حاصل تھی۔ جس طرح ولی کے قدر دانوں نے مذکورہ بالا پہلوؤں پر ایک اچٹتی سی نظر ڈالی تھی اور انھیں کبھی اس بات کا خیال نہ آیا تھا کہ ولی ایک عالم فاضل ہونے کے اعزاز کا مستحق ہے اور اس کی فارسی دانی اُس کی علمی استعداد کا ایک اہم حصّہ ہے۔ بعینہٖ ولی کے کلام میں جو معتدبہ ہندوستانی عنصر موجود ہے اسے بھی درخور اعتنا نہیں سمجھا گیا۔ اور اس پہلو کی طرف کوئی خاص توجہ مبذول نہیں کی گئی۔ احسن مرحوم نے کُلّیاتِ ولی کے دیباچہ، بزم "الموسیٰ" کے عقیدت مندوں نے "ولی نمبر" اور جامعہ عثمانیہ کی طالبات نذرِ ولی میں عقیدت کے پھول چڑھائے اور ولی کے متعلق متعدد پہلوؤں پر قابلِ قدر مضامین لکھے۔ لیکن ولی کے کلام میں ہندوستانی عنصر کی طرف کسی نے اپنی توجہ منعطف نہ کی۔

بعض ادبی اور علمی حلقوں میں اُردو شاعری پر اس کے بدیسی ہونے کا الزام لگایا جاتا ہے۔ معترضوں کا کہنا ہے کہ اردو شاعری فارسی ادب کے گہوارے

میں پہلی پھوٹی اور اس کی کل کائنات یہ ہے کہ وہ فارسی شاعری کی ایک کامیاب نقالی ہے۔ یہ کیا ظلم ہے کہ ایک شاعر ہندوستان میں بیٹھا شعر کہہ رہا ہے لیکن اس کے پیش نظر کوہ ہمالیہ کی سر بفلک چوٹیاں نہیں ہوتیں بلکہ وہ اپنے تخیل میں البرز، دماوند، اور کوہ طور کے نظاروں سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ ہندوستان کی ندیاں، گنگا اور جمنا اس کی نظر میں کوئی حقیقت نہیں رکھتیں۔ وہ ابھی تک یہی محسوس کر رہا ہے کہ وہ دجلہ و فرات یا جیحون و نیل کے کنارے بیٹھا دادِ عیش دے رہا ہے۔ ایران قدیم کے بہادر رستم و بہمن کی شجاعت کی داستانیں وہ مزہ لے لے کر بیان کرتا ہے لیکن کبھی بھولے سے بھی اس کی نظر بھیم اور ارجن کی طرف نہیں اٹھتی۔ اگر اردو شاعر بہار کا منظر پیش کرنا بھی چاہتا ہے تو عالم تصور میں وہ اپنے کو ایران کے دلکش مرغزاروں میں سرگرم تماشا پاتا ہے۔ غرض معترضین کی نظر میں ایک اردو شاعر کے یہاں غیر وطنی (بدیسی) عنصر بہت زیادہ غالب ہے۔

اگرچہ اس اعتراض کا جواب بعض حامیان اردو کی طرف سے بہت قابلیت کے ساتھ دیا گیا ہے تاہم اس اعتراض کی معقولیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اردو شاعری کی ابتدائی تاریخ پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ شروع شروع میں ہندوستانی عنصر شریک غالب کی حیثیت رکھتا تھا اور گجرات اور دکن کے نکتہ سنجوں کی ابتدائی کوششیں اس حقیقت کی آئینہ دار ہیں۔ البتہ شمالی ہند کی حالت قدرے مختلف تھی۔ اور وہاں فارسیت کا غلبہ نسبتاً زیادہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ شمالی ہندوستان میں ادبی قطع و برید سے بہت زیادہ کام لیا گیا اور بتدریج ہندی عنصر کم ہوتا گیا۔

اگر ولی کے کلام کا مطالعہ بغور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ولی اور اس کے پیش رووں نے جہاں اردو ادب کے دسترخوان پر فارسی کی چاشنی کے ساتھ انواع و اقسام کی نعمتیں تیار کر کے رکھی ہیں وہاں انہوں نے ہند کی نمکینی سے بھی اس دسترخوان کو آراستہ کیا ہے۔ الغرض ولی کا سرمایۂ ادب، عرب ایرانی ادب کہلانے کے بجائے ہند ایرانی ادب کے نام سے موسوم کیا جاسکتا ہے۔

شاعری کے دَور:۔ اُردو شاعری سب سے پہلے دو بڑے حصوں میں تقسیم ہوتی ہے یعنی دکھنی اور شمالی تاریخی اعتبار سے اسی کو تین حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں یعنی متقدمین، متوسطین، متاخرین۔ دورِ متقدمین میں گجرات و دکن کی قدیم شاعری شمار کی جاسکتی ہے۔ متوسطین میں ولی اور اس کے ہمعصروں سے دورِ اوّل کا آغاز ہوتا ہے۔ چونکہ ولی کے دور سے ایک انقلاب رونما ہوتا ہے۔ سراج، داؤد، غزلت (گجرات و دکن میں) اور بعدہٗ شاہ مبارک، شاکر و حاتم (شمال میں) متوسطین کا دوسرا دور ہے۔ تیسرا دور میر و مرزا اور چوتھا دور انشا و مصحفی کا قرار دیا جاسکتا ہے۔ متاخرین میں دور اوّل آتش و ناسخ کا ہے۔ اور مومن و غالب دوسرے دور کے نمائندے ہیں۔ مومن و غالب کے بعد امیر و داغ کا دور آتا ہے۔ اس دور کی خصوصیت کو دیکھتے ہوئے کہہ سکتے ہیں کہ یہ دور اگلے تمام ادوار کا ردِّ عمل ہے اس دور کو جدید شاعری کا پیش خیمہ قرار دیں تو نامناسب نہ ہوگا۔ اس دور کو قدیم و جدید شاعری کے دن اور رات کے درمیان کا دھندلکا کہنا بیجا نہ ہوگا۔ اس کے بعد آزاد و حالی سے جدید شاعری کا دور شروع ہوتا ہے اور اس شاعری پر بھی کئی دور گزر چکے ہیں۔

مذکورہ بالا تمام ادوار میں ایک دور کا دوسرے دور سے ایسا تعلق ہے جیسے رات کا دن سے۔ ان کی مختلف خصوصیات بیان کرنا یہاں طوالت سے خالی نہیں تاہم اتنا عرض کر دینا ضروری ہے کہ تمام خصوصیات کا سرسری مطالعہ ایک مشترک خصوصیت کی طرف ہماری توجہ مبذول کراتا ہے اور وہ یہ ہے کہ دکھن اور شمالی ہند میں ہر دور کی شاعری میں مصلحین نے ایک بات کا خاص خیال رکھا ہے کہ کلام میں فارسی کی آمیزش کی جائے اور حتی الامکان ہندی الفاظ اور قدیم محاورے چن چن کر نکال دیئے جائیں۔

اسی ذرہ نوازی کا نتیجہ آخر کار غالب و مومن کے ہاتھوں میں پہنچنے تک یہ ہوا کہ اس ذرہ کو جو خورشید کی روشنی کے بدولت چمک رہا تھا خود خورشید بنا دیا اور زمین سے اس کو آسمان پر پہنچا دیا۔ اس قسم کی تبدیلیاں کرنے کے کئی وجوہات تھے۔ اولاً شمالی ہند میں مغلیہ سلطنت کے قیام کی وجہ سے فارسی کا زیادہ چرچا رہا۔ اس سرزمین پر فارسی شاعری کا پرچم لہراتا تھا۔ ایرانی تہذیب و تمدن کا ایسے تو سارے ہندوستان پر اثر پڑا لیکن شمالی ہند پر سب سے زیادہ اثر رہا اور دیرپا رہا۔ جب اردو شاعری شمالی ہند میں پہنچی اس وقت فارسی کے بڑے بڑے شعرا موجود تھے اور انہوں نے اردو کا ہاتھ پکڑا۔ اہل ذوق کے دلوں میں فارسی کی شیرینی اور نزاکت، طرز تخیل اور وسعت اس قدر گھر چکی تھی کہ فارسی زبان اور ادب انہیں بدیسی معلوم نہ ہوتے تھے۔ جب اردو ایسے ماحول میں پہنچی تو اس پر بھی وہی اثر پڑا اور ان اردو دوستوں نے اردو شاعری کو کچھ اس طرح فارسی کے رنگ میں رنگنا شروع کیا کہ کسی طرح اردو زبان فارسی سے

کم مایہ اور کم پایہ ثابت نہ ہو۔

الغرض فارسی کا تتبع اس انتہا کو پہنچ گیا کہ اردو اردو نہ رہی اور اُردو کے ابتدائی ادوار میں فارسی کی آمیزش سے جو لطافت پیدا ہوئی تھی وہ بعض صورتوں میں عیب بن کر نظروں میں کھٹکنے لگی۔ اور اسکا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ بعض حلقوں میں اردو شاعری ہدف ملامت بن گئی۔

اُردو شاعری کے متعلق عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اس میں لے دے کر غزل ہے اس کا دائرہ نہایت محدود ہے۔ یہ گُل و بلبل لنگھی چوٹی کی شاعری ہے۔ اس میں رقیبوں کی بہتات ہے۔ شاعروں کے خیالات میں یک رنگی نہیں، کہیں صوفی و زاہد پاک ذات، تو کہیں رند شاہد باز، کہیں واعظ خشک تو کہیں خرابانی پاک باز، اردو شاعری میں معشوق مرد ہوتا ہے۔ معشوق کا ظلم و ستم ایک قصاب کی تصویر پیش کرتا ہے۔ اس شاعری میں بدیسی چیزیں ہیں۔ یہ غیر فطری ہے۔ اس میں ہندوستانیت بہت کم پائی جاتی ہے وغیرہ بعض اہل علم حضرات اس قسم کی نکتہ چینی کا معقول جواب دے چکے ہیں۔

اگر اردو ادب کا بغور جائزہ لیا جائے تو یہ معلوم ہوگا کہ جہاں اردو نے فارسی سے خوشہ چینی کی ہے۔ وہاں اردو ہندی ادب اور ہندوستان کی دیگر زبانوں کی بھی زیر بار احسان ہے۔ پہلے تو اردو کی عمارت کی بنیاد ہی ہندوستانی زبان پر ہے۔ اردو کے سابقوں اور لاحقوں کو دیکھئے کہ فارسی اور عربی کے ساتھ ساتھ ہندی بھی ہیں۔ مصادر پر غور کیجئے تو جہاں عربی اور فارسی سے گڑھ لئے گئے ہیں وہاں ہندی ترکیب پر بھی بنائے گئے ہیں۔ مفردات کو چھوڑ کر مرکبات

کو دیکھیئے تو وہ بھی ہندی اور عربی فارسی کے میل سے بنائے گئے ہیں یہ سب اُردو میں ایسے کھپائے گئے ہیں کہ ہندی معلوم نہیں ہوتے۔ لیکن انصاف کا تقاضہ یہ ہے کہ تمام توضیح و تشریح کے باوجود بھی ہمیں اس بات کا اقرار کرنا ہوگا کہ ہمارے شعرائے کرام نے اپنے ملک کی روایات، آسمان شکوہ پہاڑ، ملک کی امرت بھری ندیوں، ملک کے پھل پھول اور ملک کے کرشن اور رادھا سے بہت اجنبیت برتی ہے اور یہ کہنے والا کوئی نہ نکلا کہ

ندیاں ہماری امرت کے دھارے
دنیا سے اونچے پربت ہمارے
اپنے وطن میں سب کچھ ہے پیارے

مندرجہ بالا تفصیلات سے واضح ہو چکا ہوگا کہ ہندوستانی عنصر کی کمی شمالی ہند کے نازک مزاج شعرائے کرام کی کرشمہ سازیوں کا نتیجہ تھی گجرات و دکن بھی کسی حد تک اس گناہ کے مرتکب ہیں کیونکہ یہ پودا گجرات و دکن ہی میں پہلے بار آور ہوتا ہے۔ اس کے باوجود اتنا ضرور کہنا ہوگا کہ اگر اُردو شاعری کا سفینہ گجرات و دکن کے ناخداؤں کے ہاتھوں میں رہتا تو وہ کم از کم اردو شاعری کی بعض پرانی خصوصیات کو قائم رکھ کر اور اس کے دیسی ہونے کے کچھ ثبوت دے کر اسے طعن اغیار کی زد سے بچا لیتے۔

یہ بات بلا خوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ شمالی ہند کے شعراء کے کلام میں فارسیت کا جو موجیں مارتا سمندر ملتا ہے وہ گجرات و دکن کے ابتدائی ادوار میں محض ایک لہر سے زیادہ حقیقت نہ رکھتا تھا یعنی یہی خصوصیت خاص

اُردو کے آغاز سے برابر اس ادب کا طغرائے امتیاز رہی۔ اردو کی ادبی تشکیل کے زمانے سے لے کر ولی کے دور تک یعنی ۹۰۰ھ سے ۱۱۰۰ھ تک اردو ادب کے جو نمونے ملتے ہیں ان میں پیران طریقت کے ارشادات گرامی بھی ہیں۔ قطب شاہی اور عادل شاہی ادوار میں بزمیہ، رزمیہ، مثنویاں، غزل، قصیدے، مرثیے وغیرہ ملتے ہیں اور اس تمام کلام کے پڑھنے سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ نظم کا طرز تخیل ہندی ہے۔ الفاظ زیادہ تر مقامی زبانوں سے لئے گئے ہیں۔ روایات ضرور مذہبی ہیں۔ جو عرب اور ایران سے تعلق رکھتی ہیں۔ فارسی الفاظ کو اردو میں ہاجن، علی جیو گام دھنی اور ان کے بعد آنے والے صوفیہ نے کسی حد تک استعمال کیا ہے۔ بلکہ بوقت ضرورت انہوں نے فارسی محاوروں کا یا تو ترجمہ کر لیا ہے یا انہیں بجنسہٖ کھپا دیا ہے۔ جیسے رقص پرسے 'رقصے' بنا لیا۔ ہندی اور ان کے ساتھ ساتھ فارسی کی بحروں کو روشناس کرانے والے انہیں میں سے علی جیو ۹۷۳ھ اور خوب محمد چشتی متوفی ۱۰۲۳ھ تھے۔ فارسی صنعتوں کو بھی اسی دور میں اردو کے دربار میں باریابی ملتی ہے۔

۱۰۵۰ھ کے بعد سے ولی کا دور شروع ہوتا ہے۔ غزل کا یہ باوا آدم اردو شاعری میں غزل کو کچھ ایسے انوکھے ڈھنگ سے روشناس کراتا ہے کہ پورے اردو ادب میں ایک انقلاب برپا ہو جاتا ہے اور اس طرز نو کی شمالی ہند میں ایسی دھوم مچی کہ سخن وران باکمال اور شیدایان نغمہ شیراز کے دل بھی اس ترقی یافتہ رنجیتہ نے موہ لئے اور ان سخنوروں نے دو دو چار چار شعر اس طرز نو میں کہہ کر اپنا شوق پورا کیا۔

عالم گیری دور کے ایک امیر مرزا معز الدین فطرت موسوی کا شعر ہے :-

در زلف سیاہ تو بدل دھوم پڑی ہے
در خانۂ آئینہ گتا (گھٹا) جھوم پڑی ہے

اس دور کے ایک اور شاعر قزلباش خاں امید کا شعر ہے ؎

بامن کی بیٹی آج میری آنکھ مون پڑی
غصہ کیا و گالی دیا اور دگر لری

مرزا عبدالقادر بیدل سے کون واقف نہیں۔ ان کے شعر ہیں :-

مت پوچھ دل کی باتیں وہ دل کہاں ہے ہم ہیں
اس تخم بے نشاں کا حاصل کہاں ہے ہم ہیں
جب دل کے آستاں پر عشق آن کر پکارا
پردے سے یار بولا بیدل کہاں ہے ہم ہیں

مرزا علی قلی خاں ندیم بھی عالم گیری دور کے اساتذۂ فارسی میں شمار کئے جاتے تھے۔ کہتے ہیں :-

جدائی میں تری ہم کیا کہیں کس طرح جلتے ہیں
بجائے مو بدن سے آگ کے شعلے نکلتے ہیں
بیقرار عشق کو ہے زندگی نقص کمال
مرچکی سیماب تب کہتے ہیں یہ اکسیر ہے

سراج الدین علی خاں آرزو جنکے چشمہ فیض سے کئی نامور شعرا سیراب ہوئے اور جن کی فارسی دانی ایک زمانہ میں مسلم ہے ان کے اشعار ملاحظہ فرمائیے :-

ہر صبح آتا ہے تیری برابری کوں
کیوں دن لگے ہیں دیکھو خورشید خاوری کوں
میخانے آج جا کر شیشے تمام توڑے
زاہد نے آج اپنے دل کے پھپھولے پھوڑے

الغرض شمالی ہند میں میر صاحب اس کو معشوق دکن کہہ کر تعظیم کو اٹھتے ہیں اور سودا اور قائم اس کو لچر سی بات سمجھ کر بھی منھ لگا لیتے ہیں۔ اور اردو نظم کی اس مقبولیت کا سہرا ولی کے سر ہے۔ کیونکہ ولی نے ریختہ کو ایسی اچھی صورت میں پیش کیا کہ وہ سب کو بھا گیا۔ کہا جاتا ہے کہ ولی نے شاہ گلشن کے ایما سے اپنا طرز بیان بدلا۔ اور فارسی سے مضامین لے کر اردو میں انہیں داخل کرنا شروع کیا۔ لیکن اس بیان میں صرف اتنا وجود معلوم ہوتا ہے کہ شاہ گلشن نے برہان پور یا گجرات ہی میں ملاقات کے وقت ولی کے اس طرز جدید کی تعریف کی ہوگی یا بر سبیل تذکرہ فارسی کی آمیزش کے متعلق کچھ کہا سنا ہوگا۔ بزرگوں کے بیان کی تردید کے لئے بڑی شہادت یہ ملتی ہے کہ ولی خود اختراع پسند دماغ لے کر آیا تھا۔ اس کے سامنے گجرات و دکن کے نمونے موجود تھے۔ جن میں فارسی آمیزش کی خصوصیت دور اولین سے چلی آتی تھی۔ ولی خود ادب کا بڑا نبض شناس تھا۔ وہ ادب کے نشیب و فراز سے خوب واقف تھا۔ فارسی ادب پر بھی اس کو کافی عبور حاصل تھا۔ اور اس لحاظ سے ولی ایسے آدمی کو رہبروں کی ضرورت نہ تھی بلکہ پیروؤں کی ضرورت تھی۔ یہی اختراع پسندی تھی جس نے ولی کو دوسرے شعراء سے ممتاز قرار دیا اور اسی خصوصیت کی وجہ سے آج بھی اردو زبان

کے قدر دان ولی کو غزل کا امام سمجھتے ہیں۔ ولی نے جو خدمت انجام دی وہ خدمت نہ تو معمولی تھی اور نہ کسی معمولی شخص کے بس کی بات تھی۔ یہ خدمت ولی کا سا ہی ترقی پسند اور بے شمار قابلیتوں کا مالک نہایت خوش اسلوبی سے انجام دے سکا جس کا بڑا ثبوت اس طرز نو کی عام مقبولیت ہے۔

ولی اپنے پیش روؤں کے نقش قدم پر چلا اور اس نے اپنی گرہ کا بھی کچھ صرف کیا۔ ولی سے پہلے بھی فارسی ادب سے اردو میں کافی مدد لی گئی لیکن ایک عرصہ تک کچھ ایسی بے جوڑ سی بات رہی کہ قدم قدم پر مصلح کی ضرورت محسوس ہوتی تھی۔ آخر ولی نے آکر اس کمی کو پورا کیا اور فارسی ادب سے ایسی پیوند کاریاں کیں اور ایسی موزونیت پیدا کر دی کہ اردو شاعری کو چار چاند لگ گئے۔ دوسری طرف ولی نے ہندوستانی ماحول اور عنصر کو بھی ہاتھ سے جانے نہ دیا اور اس طرح کچھ ایسا امتزاج پیدا کر دیا کہ یہ مے دو آتشہ ہر صوفی و رند کی مجلس میں بار پانے کے قابل ہو گئی اور نئے اور پرانے میکش سب ہی اس سے سرشار ہونے لگے۔

افسوس کہ ولی نے جس قسم کی نخل بندی کی تھی اور جس امتزاج سے اس چمن زار کو دیسی اور بدیسی پھولوں کے پودوں سے سجایا تھا۔ اس کی آبیاری میں اس کے پیروؤں نے کوتاہی تو نہیں کی لیکن آہستہ آہستہ اپنے خیال، اپنی پسند اور ظاہرا مانگ کو دیکھتے ہوئے دیسی پھولوں کو چن چن کر نکال پھینکا۔ اس قسم کی صفائی کوئی بے معنی نہیں تھی لیکن اس رجحان سے زبان کو یہ صدمہ پہنچا کہ ثقیل اور بھدے محاوروں اور الفاظ کے ساتھ اچھے لفظ اور محاورے بھی

ٹکسال باہر قرار دیئے گئے اور اچھا خاصا ذخیرہ اردو میں سے کم ہو گیا۔

ہم تسلیم کرتے ہیں کہ بعض اصلاحیں قابل داد ہیں جیسے سہن کا 'سہم' بنالیا گیا۔ 'سنگات' سے 'ساتھ'، 'سُین' اور 'سیتی' سے 'سے' بنالیا گیا۔ 'بھواں، پلکاں، سے بھویں، پلکیں، بنالیا 'کوں' کا 'کو' اور 'سوں' کا 'سے' ہو گیا۔ 'مجھ آنسو' سے 'میرے آنسو' 'بھر نظر' سے 'نظر بھر'۔ اُن نے 'جن نے' سے 'اُس نے، جس نے، یا 'تسبی، کی صحیح املا 'تسبیح' اور 'سہی' کو صحیح املا میں 'صحیح' لکھنا شروع کیا۔ یہ مشتے نمونہ از خروارے ہیں۔ ورنہ ایسے بے شمار الفاظ نکلیں گے جو قابل اصلاح تھے اور جو ترک بھی کر دیئے گئے لیکن یہ کہاں کا انصاف تھا کہ ہندی الفاظ جو فارسی الفاظ سے کسی طرح لوچ اور شیرینی میں کم نہیں تھے نکال دیئے گئے۔ جیسے سجن، سریجن، موہن، پلیتم، بچن، سکھ مکھڑا، نین وغیرہ ایسے بے شمار الفاظ ملیں گے جنھیں متروک کر دیا گیا۔ اسی طرح بدیسی تلمیحات اور استعارات کی بھی اتنی ہی بہتات ہو گئی ورنہ یہی جیحون اور سیحون دور اوّلین میں اردو ادب میں محض پانی کے سوتے تھے جو آخر میں شاندار امرت کے دھارے بلکہ خود سمندر بن گئے کہ ان سے ڈر معلوم ہونے لگا۔ اسی طرح کوہ الوند اور البرز نے بھی اب ہمیں ڈرا دیا۔

جہاں تک تلمیحات کا تعلق ہے فارسی کی تلمیحات سے ہمارے ادب میں ضرور اضافہ ہوا۔ اور تلمیحات کا دائرہ جتنا وسیع ہوتا ہے اتنا ہی ادب کو فائدہ پہنچتا ہے تلمیحات سے بڑے بڑے قصے جن کو بیان کرنے کے لئے دفتر درکار ہیں وہ جملوں میں ادا کئے جا سکتے ہیں۔ تلمیحات سے مذہبی عقائد،

رسوم، تاریخی واقعات وغیرہ سے آگاہی ہوتی ہے۔ اگرچہ فارسی سے کچھ تلمیحات لی گئی ہیں۔ ان کی ہمیں ذرا شکایت نہیں۔ لیکن ہم ہندوستان سے بھی اسی قدر فائدہ اٹھا سکتے تھے۔

جب ہم ولی کا کلام دیکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس مصلح زبان نے ہندوستان کی تاریخی، مذہبی، معاشرتی ہر قسم کی تلمیحات کو اپنے کلام میں کھپایا ہے رستم و اسفندیار کے مقابلہ میں ارجن کو لا کھڑا کیا ہے تو جور و قصور کے ساتھ ساتھ کرشن اور گوپیوں کو بھی جگہ دی ہے۔ مکہ و مدینہ کے ساتھ کاشی اور ہردوار کو بھی نہیں بھولا۔ جوگی، بیراگی اور سنیاسی کو صوفی صافی کی صف میں جگہ دی ہے۔ ایک طرف عید سعید ہے تو دوسری طرف دیوالی کے دیئے بھی روشن نظر آتے ہیں، ولی ایک طرف تو فارسی شاعری کے تتبع میں مرہٹہ لڑکے کو اپنا معشوق قرار دیتا ہے تو دوسری جانب ولی کا معشوق اپنی تمام نسوانیت کے ساتھ رونما ہوتا ہے۔ اسی طرح چنگ و رباب کے ساتھ بانسری کے سُریلے سر سنائی دیتے ہیں تو کسی جگہ طبلہ کی تھاپ گونجتی ہے اور راگ الاپے جاتے ہیں۔ جیحون و سیحون اور نیل و فرات کا ہمیں کہیں پتہ نہیں چلتا لیکن گنگ و جمن اور تاپتی اور نربدا کے دھارے بہتے نظر آتے ہیں۔ جہاں زیور، سنگھار اور خور و نوش کا ذکر کیا ہے وہاں ہندی زیورات اور احمد آبادی حلوے سوہن کو نہیں بھولا ہے۔

الغرض ولی کے کلام میں جو کچھ ہندی عنصر پایا جاتا ہے کوئی غیر ارادی طور پر نہیں روشناس کرایا گیا لیکن صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ولی نے کسی

خاص مقصد کے تحت یہ کام کیا ہے۔ اور یہ مقصد فارسی اور ہندی سے ایک امتزاج قائم کرنا تھا جس کی وجہ سے ارادتاً ایسی پیوندکاری کی گئی ہے۔ ولی کے کلام میں لاحقے، سابقے اور مرکبات وغیرہ بھی اسی امتزاج کے غماز ہیں۔

یہاں ولی کے کلام میں سے بطور نمونہ چند مثالیں درج کی جاتی ہیں۔ ولی نے خصوصاً صنعت ایہام، مناسبت لفظی وغیرہ میں ان ہندی ناموں اور لفظوں سے بڑا فائدہ اٹھایا ہے اور بڑی سلیقہ مندی سے کھپانے کی کوشش کی ہے:۔

جو دھا جگت کے کیوں نہ ڈریں تجھ سوں اے صنم
ترکش میں تجھ نین کے ہیں ارجن کے بان آج

تب کا مشتاق جی ہے لچھمن سوں
کشن سوں جیسکہ رام رامی ہے

کشن کی گوپیاں کی نہیں ہے یہ نسل
رہیں سب گوپیاں وہ نقل یہ اصل

گرچہ لچھمن ترا ہے رام ولے
اے سجن تو کسی کا رام نہیں

رات دن انچھواں میں اپنے شاستر کرتا ہے تر
اے برہمن دیکھ نجکوں بید خواں مجنوں ہوا

اس کے خط و خال سے پوچھو خبر
بوجھتا ہندو ہے باتاں بید کی

کیا وفادار ہیں کہ ملنے میں دل سوں سب رام رام کرتے ہیں

لیلاوتی تو خواب میں پائی ہے منتھی
ہر شب تری زلف سوں مطول کی بحث تھی

جگت جوگی ہوا ہے دیکھ تجکوں
سرج جوگی۔ فلک جوگی کی مڑھے

زلف تیری ہے موج جمنا کی
پاس تِل اس کے جیوں سناسی ہے

مقامات :-

کوچۂ یار عین کاسی ہے
جوگی دل وہاں کا باسی ہے

اے صنم تجھ جبیں اُپر یہ خال
ہندوے ہر دوار باسی ہے

کروں کیوں سنگ دل کے دل کو تسخیر
زبردستی میں بیجاپُر کا گڑھ ہے

ہندی سازوں اور راگ راگنیوں کے نام :-

سوزن سوں تجھ پلک کی اے نور جان و دیدہ
ہر استخواں میں روزن ہے بانسلی کے مانند

تیرے غم میں دِل سوراخ سوراخ
کیا پیدا صدائے بانسلی کوں

ہوا رباب رگاں خشک و استخواں ہے مغز بہ حال دیکھ کے مجلس میں دنگ ہے مردنگ

رہے بدن پہ طنبورے کے تار گنتی کے
غصے سوں اس پہ جو آ مفلسی نے مارا چنگ
دل کو شادی ہے کیوں نہ باجے آج
ہر طرف جگ میں تال اور منڈل
پی کوں دیکھا نہیں ہوں اس نوبت
دل میرا اس سبب سوں جھانجھ میں ہے
آوے فلک سوں زہرہ اُتر گروہ مہ جبیں
اِک تان گاوے رام کلی یا بھباس میں

نندیاں :-

ترے غم سوں بیتی ہے چھاتی مری
ہوئے اشک سوں دو نین نربدا
گنگا رواں کیا ہوں اپس کے نین ستی
آ اے صنم شتاب ہے روزِ نہان آج
زلف تیری ہے موج جمنا کی
پاس تِل اس کے جیوں سناسی ہے

زیور اور سنگار :-

اِس رین اندھیری میں مت بھول پڑوں تس سوں
ٹک پاؤں کے بچھوؤں کی آواز سنائی جا

تمھیں ملنے سوں گر اپنے سہاگن ناکروگے مجھ
تو چوڑا گجری کا اور کریلا دھار کرنا کیا

(نوٹ :۔ چوڑا گجری = ہاتھی دانت کی بڑی چوڑیاں)

دونوں بھواں کے میانی ٹیکا نہیں زری کا
ہے قوس کے بُرج میں جھلکا مشتری کا
مہ جبیں پر لگائے کیوں ٹیکا
ماہ میں کام کیا ہے دیویکا
ہنسلی تجھ گل میں دیکھ کہتے ہیں
چاند سیں مکھ کا ہے یو ہالا
تجھ عشق میں جل جل کر سب تن کو کیا کاجل
یہ روشنی افزا ہے انکھین کو لگاتی جا
موہن اِدھر رنگین بدل کھا پان مسّی لائے ہیں
لب پر شفق اور شام کوں ایک ٹھار کر دکھلائے ہیں

پھول :۔

محصور کیا جگ کوں سجن تیری گلی نے
دیکھ نا سکے تجھ چشم سوں چنبے کی کلی نے
نین دیول میں پتلی ہے دیا کعبہ میں ہے اسود
ہرن کا ہے یو ناف یا کنول بھیتر بھنور دستا

دیوالی :۔

تری زلفاں کے حلقے میں دِسے یوں نقش رُخ روشن
کہ جیسے ہند کے بھیتر لگیں دیوے دوالی میں

حلوا :-

اے شکر لب قند سوں تجھ لب کی باتاں ہیں لذیذ
حرف تیز اس کے ہیں جیسے حلوۂ سوہان لذیذ

پان :-

کرتا ہوں جاں سپاری ، کتھی ہیں ہاتھ جس کے
کرنے کوں دِل کا چونا آتا ہے پان کھا کر

لاحقے اور مرکبات ملاحظہ فرمائیے :-

کیا مدہوش مجھ دل کو انیندی نیں ساقی نے
عجب رکھتا ہے کیفیت زمانہ نیم خوابی کا

(انیندی = بے خوابی)

ہر جنس کا معمّا بوجھا گیا ہے اما
تجھ راز کا معمّا جگ میں رہا ہے انحل

(انحل = لاینحل)

مرکبات :-

ترکش اپس جبیں سوں نکال اے شکر بچن
عشاق پر غضب ہے یہ ناز و ادا نہیں
گریباں صبر کا مت چاک کر اے خاطر مسکیں
سنے گا بات وہ شیریں بچن آہستہ آہستہ

مُکھ سوں تیرے بچن مبارک سُن
گل کے گوہر ہوا سراپا آب
شنا لکھنے میں اس آہو نین کی
ہوا جیوں شاخ نرگس ہر قلم سبز

اِسی طرح ولی نے ہندی الفاظ کے ساتھ فارسی اضافت کثرت سے استعمال کی ہے۔ جیسے نقش چرن، رنگِ پان، روزِ نہان، نینِ ساتی وغیرہ۔

آخر میں دو ایک غزلیں ملاحظہ فرمائیے جن میں محبوب اپنی تمام نسوانیت کے ساتھ جلوہ گر ہے:۔

مت غصہ کے شعلے سوں جلتے کوں جلاتی جا
ٹک مہر کے پانی سوں یہ آگ بجھاتی جا
تجھ چال کی قیمت سوں نہیں دل ہی مرا واقف
اے مان بھری چنچل ٹک بھاؤ بتاتی جا
اس رین اندھیری میں مت بھول پڑوں تجھ سوں
ٹک پاؤں کے بچھوں کی آواز سناتی جا
مجھ دل کے کبوتر کوں پکڑا ہے تری لٹ نے
یہ کام دھرم کا ہے ٹک اس کو چھڑاتی جا
تجھ مکھ کی پرستش میں گئی عمر مری ساری
اے بت کی بچن ہاری ٹک رین بتیس بجاتی جا

تجھ عشق میں جل جل کر سب تن کوں کیا کاجل
یہ روشنی افزا ہے انکھیاں کوں لگاتی جا
تجھ نیہ میں دل جل جل جوگی کی لیا صورت
یک بار اسے موہن چھاتی سوں لگاتی جا
تجھ گھر کی طرف سندر آتا ہے ولی دایم!
مشتاق درس کا ہے ٹک درس دکھاتی جا
چلنے منیں اے چنچل ہاتی کوں لجا دے توں
بیتاب کرے جگ کوں جب ناز سوں آوے توں
یک بارگی ہو ظاہر بے تابی مشتاقاں
جس وقت کہ غمزے سوں چھاتی کوں چھپاوے توں
گویا کہ شفق پیچھے خورشید ہوا ظاہر
جب اوٹھ میں پردے کے چہرے کوں دکھاوے توں
لوئی فلک مکھ میں انگشت تحیّر لے
جب پاؤں نزاکت سوں مجلس میں نچاوے توں
عشاق کی شادی کی اس وقت بجے نوبت
رنگ کی جس ساعت آواز سناوے توں
یک تان سنانے میں جی تان لیا سب نے
اب دل سوں بکیں سارے گر بھاؤ بتاوے توں
تو بائے ریائی سوں شاید کہ کرے توبہ اس وقت ولی کوگر بھر جام پلاوے توں

ان غزلوں میں ولی فارسی شعرا کی تقلید سے آزاد ہو کر ایک نئے باب کا اضافہ کرتا ہے لیکن افسوس ہے کہ ولی کے بعد آنے والے شعرا اس تبدیلی کی اہمیت کو کماحقہٗ نہیں سمجھے۔

ولی کی زبان

ولی کے کلام کی خصوصیات بیان کرنے سے پہلے اردو کی تین ادبی شاخوں دہلوی، دکنی، گجری کی اہم لسانی خصوصیات کا سرسری جائزہ مفید مطلب ہوگا۔

اُردو اپنے ارتقا کی منزلوں میں کئی ناموں سے یاد کی گئی ہے۔ اس کا ایک نام دہلوی بھی ملتا ہے۔ خسرو اور رباجن نے کس زبان کو دہلوی کہا ہے اور خسرو کے بعد صوفیا نے اُردو کو ہندی یا ہندوی کیوں کہا اس سے اس وقت بحث نہیں۔ دہلوی کھڑی بولی کا دوسرا نام ہے اور ماہرین لسانیات نے اس کی جو لسانی خصوصیات بیان کی ہیں اور شمالی ہند میں جو ابتدائی ادبی نمونے ملتے ہیں ان کو یہاں درج کیا جاتا ہے۔

دہلی میں مخلوط بولی کا آغاز خسرو سے بہت پہلے ہو چکا ہوگا۔ بعض محققین کے خیال کے مطابق مسلمانوں کی آمد سے پہلے بھی یہ موجود تھی۔ صوفیوں کے فقروں اور ارشادات میں اس کی داغ بیل کی نشانیاں ملتی ہیں۔ بھگتی تحریک کی وجہ سے اس کو پھلنے پھولنے کا سہارا بھی مل گیا تھا تاہم اس کا کوئی واضح روپ سامنے نہیں آیا تھا اسی لئے ابتدائی دور کے صوفیوں نے مقامی زبانیں اپنا لی تھیں جس کے ذریعہ وہ پیغام وحدت لوگوں تک پہنچا رہے تھے۔

عہد جہانگیری میں افضل جھنجھانوی (۱۶۲۵ء) کی تصنیف بکٹ کہانی دہلوی روپ کی اوّلین

ادبی کاوش منظرِ عام پر آئی۔ سترھویں اور اٹھارہویں صدی کے ادبی نمونوں کو دیکھنے سے پہلے دہلوی شاخ کی چند لسانی خصوصیات ذہن میں رکھئے۔

۱۔ ماضی مطلق بنانے کے لئے امر کے آگے یا بڑھا دیتے ہیں جیسے۔

چل سے چلیا۔ مار سے ماریا یعنی مارا۔ لگ سے لگیا یعنی لگا۔

۲۔ حرفِ علت کا اضافہ جیسے

سکھانا سے سکھاونا۔ آنا سے آونا۔ لہو سے لوہو۔ رکھنا سے راکھنا۔

۳۔ نون غنہ جیسے

تو سے توں۔ کو سے کوں۔ آئے سے آئیں۔ پہلے سے پہلیں۔

۴۔ ہائے ہوز کی آواز کو سادہ ہندی آواز سے تبدیل کر لینا جیسے

بھی سے بی۔ مجھے سے مجے۔ کچھ سے کچ۔

۵۔ جمع بنانے کے لئے 'اں' کا اضافہ کیا جاتا ہے جیسے

شہر سے شہراں۔ گھر سے گھراں۔

۶۔ آکر۔ روکر۔ جاکر کے آئے کر۔ روئے کر۔ جائے کر کے روپ عام ہیں۔

۷۔ حرف 'نے' بطور علامت فاعلی اور مفعولی دونوں طرح سے مستعمل ہوتا ہے۔

۸۔ کوزی آواز بجائے ٹھیٹ دار آواز جیسے بڑا سے بڈا۔ پڑھنا سے پڈھنا۔

مذکورہ بالا خصوصیات ہریانی اور دہلوی دونوں میں مشترک ہیں۔[1]

سترہویں اور اٹھارہویں صدی کے دہلوی کے دو نمونے یہاں پیش کئے جاتے ہیں۔

نوٹ:۔ [1] علیگڈھ تاریخ ادب اردو لسانیاتی مقدمہ از مسعود حسن خاں۔

بکٹ کہانی از افضل متوفی ۱۶۲۵ء / ۱۰۳۵ھ

سنو سکھیو بکٹ موری کہانی — بھئی ہوں عشق کے غم ہوں دوانی
نہ مجکو سوکھ دن نہ نیند راتا — برہ کے درد میں سینہ پراتا
تمامی لوگ مجھ یوں کہیں ری — خرد گم کردہ و مجنوں کہیں ری
نہیں اس درد کا دارو کسی کن — بھئے حیراں سبھی حکماء ذوقن
اری یہ ناگ جس کوڈس کے جاوے — پناوے گارڈو جیو راگنوائے
اری جس شخص کو یہ دیو لاگا — سیانا دیکھ اس کو دور بھاگا
اری یہ عشق ہے یا کیا بلا ہے — کہ جس کی آگ میں سب جگ جلا ہے
کہ جس کے بیچ یہ آتش پری رے — وہی دن رین سلگت ہے سریرے[1]
وغیرہ

مثنوی اسماعیل امروہی تصنیف ۱۷۰۸ء / ۱۱۲۰ھ

الٰہی توں دانا ہے ہر کاج کا — سرانجام دیتا ہے محتاج کا
ہر ایک آرزو کی پوراتا ہے آس — کبیراں صغیراں فقیراں نراس
جیتے ہیں گے مخلوق ہر ایک جہاں — تری نعمتاں کاج بولیں بکھان
کیتی شے ہے ظاہر کیتی غیب دار — تو نہیں بوجتا ہے غریب الدیار
بارا کوس تائیں و لشکر پڑے — ہر ایک ملک کے شاہ اس سوں ڈرے
شتر گھوڑے ہاتھی رہے بے گنت — دوجے گاؤ خانہ اونٹ کا نہ انت
سخن یہ سنا کافرے نابکار — غصے ہو گیا بولیا آشکار

---

[1] مضمون ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی صاحب از علیگڈھ تاریخ ادب اردو جلد اوّل

وزیراں میں سیں بولا ایک وزیر — فہم اور فراست میں تھا گھنیر
خدائے حُسن بھوت دیتا جمال — نہ دلیا کوئی درجہاں خوش خصال
یکے جھاڑ انار اس جائے تھا — دو پھل اس کوں بھوسال وہاں آوتا[1]

اُردو کی دکنی شاخ کے بارے میں دو نظرئے سامنے آتے ہیں۔ ایک گروہ اس نظرئے کا قائل ہے کہ اردو شمالی ہند سے دلّی لے جائی گئی۔ جہاں دکنی زبانوں اور دکنی تہذیب کے زیر اثر ترقی کرکے دکنی شاخ کی حیثیت سے یاد کی جانے لگی۔ بعضوں کا یہ خیال ہے کہ دکنی کو شمالی بولی یا زبان سے کم واسطہ ہے اور دکنی شاخ مہاراشٹری (مرہٹی) کے زیر اثر تعمیری دَور سے گذری ہے۔ یہ لوگ اپنے بیان کی تصدیق میں مہاراشٹری اپبھرنش اور مرہٹی کی صرفی و نحوی مماثلوں کو پیش کرتے ہیں۔

دکن میں دکنی مخلوط بولی کے ابھرنے اور ادبی شکل اختیار کرنے کے کئی اسباب تھے۔ دکن سے مہاراشٹر کا جو علاقہ مقصود ہے وہاں کنڑ، تلگو، مرہٹی وغیرہ زبانیں بولی جاتی تھیں تیرہویں صدی عیسوی کے اواخر میں مسلمانوں نے دکن پر فتح حاصل کی۔ اس فتح کے بعد سے فارسی ترکی بولنے والے دکن کی سرزمین پر پہنچے۔ شمالی ہند کے لوگوں کے لئے دکن کی کئی زبانیں سیکھنا اور بولنا مشکل امر تھا۔ قدرتی طور پر افہام و تفہیم کے لئے کوئی درمیانی راستہ نکالا گیا ہوگا۔ یہ درمیانی راستہ مخلوط بولی تھا۔ جو فارسی ترکی کے عناصر کا مقامی زبان میں اشتراک کے سوا کیا ہو سکتا ہے شمال سے اسی زمانہ میں دہلوی یا کھڑی بولی بھی دکن پہنچی ہوگی۔ امیران صدہ کے قیام دکن اور ان کے سیاسی سماجی نظم و نسق کے سلسلہ میں اہل دکن سے تعلقات نے فارسی عنصر کی مقامی زبان میں جڑیں مضبوط کی ہوں گی۔ محمد تغلق کا دکن دارالخلافہ کی منتقلی کا عمل بھی مخلوط بولی کے پنپنے میں

---

[1] مضمون ولی اور اس کا عہد ۔ علیگڈھ تاریخ ادب اردو مضمون از سروری علیگڈھ تاریخ

اہمیت رکھتا ہے اور دکن کی پڑوسی بولی گجری نے سب سے زیادہ اپنا اثر دکنی پر ڈالا۔
بہمنی حکومت کے قیام سے صوفیاء کی آمد نے اس مخلوط بولی کو فروغ بخشا اتنا ہی نہیں بلکہ
دکنی کی ادبی تشکیل کی اہم خدمت بھی انہیں نفوس قدسیہ نے انجام دی۔ ۱۷ ویں صدی میں
بیجاپور اور گولکنڈہ کے بعض تاجداروں کے عہد میں اس کو شاہی سرپرستی حاصل ہوگئی
اس طرح دکنی نے خانقاہوں کے علاوہ درباروں اور محلوں میں بار پانے کی وجہ سے دن
دونی ترقی کی۔ شاعر اور نثر نگار پیدا ہو گئے۔ تاجداروں نے بھی دکنی میں ہزاروں شعر کہے
عالمگیری دور میں تو اورنگ آباد دکن دہلی بن گیا تھا۔ اسی وجہ سے اورنگ آبادی محاورہ دکنی
سے قدرے صاف شستہ پایا جاتا ہے۔

اس موقع پر دکنی شاخ کی بنیادی خصوصیات کے مطالعہ سے واضح ہوگا کہ
دکنی شاخ نے مرہٹی، دہلوی، گجری سب کی خصوصیات کو اپنے میں سمو لیا تھا۔

دکنی شاخ کی چند خصوصیات ملاحظہ کیجئے۔

۱ لفظ کے درمیانی (و) (ی) (الف) کو تلفظ میں گرا دیا جاتا ہے۔ جیسے
مانگتا سے منگتا۔ میٹھا سے مٹھا۔ نزدیک سے نزک۔ مانند سے منڈ۔ سوکھا سے سکا
آسان سے اسان۔

۲ بعض الفاظ میں ہکاری آوازیں سادہ بندشی آوازیں بنا دی جاتی ہیں۔
بہ الفاظ دیگر درمیانی حرف گرا دیا جاتا ہے۔ جیسے کدھر سے کدر کہاں یہاں،
وہاں سے کاں، یاں، واں ہو جاتا ہے۔

۳ بعض الفاظ میں ٹ کے ساتھ ھ بڑھا دی جاتی ہے جیسے
لٹو سے لٹھو۔ موٹا سے موٹھا۔ الٹا سے الٹھا۔ مرہٹی زبان میں بھی یہ خصوصیت ہے۔

۴ اسی طرح (ڑ) پر (ڈ) کو ترجیح دی جاتی ہے۔

۵ کوزی آواز کی جگہ دندانی آوازیں استعمال کی جاتی ہیں دو کوزی اوازوں میں سے ایک (ت) سے بدل جاتی ہے۔ جیسے ٹکڑا سے تکڑا۔ ٹٹو سے تٹو۔ ٹاٹ سے تاٹ مرہٹی زبان میں بھی یہ خصوصیت موجود ہے۔

۶ حرف حصر کی (ہ) حذف کردی جاتی ہے جیسے تمہی سے تمی۔ مجھے سے مجے

۷ زور پیدا کرنے کے آخر میں (چ) بڑھا دی جاتی ہے جیسے تمہی سے تمچ ۔ اس ہی سے اسچ۔ ایسا ہی سے ایسا چ۔ مرہٹی زبان میں بھی یہ خصوصیت پائی جاتی ہے۔

۸ (کر کر) کا استعمال دکن اور گجرات میں کثرت سے پایا جاتا ہے جیسے۔ یاد کر کے کی بجائے یاد کر کر۔ کوئی شخص عبداللہ نامی کی بجائے کوئی شخص عبداللہ کر کر

۹ بعض مصادر کے آخر میں (ی) بڑھا دی جاتی ہے جیسے انتظار سے انتظاری۔ یادگار سے یادگاری۔

۱۰ جمع بنانے کے لئے (ان) کا اضافہ کیا جاتا ہے جیسے۔ جھاڑ سے جھاڑاں ۔ باغ سے باغباں ۔ عورت ، عورتاں

۱۱ اسی طرح فعل کی بھی جمع بنائی جاتی ہے۔ جیسے آئیں ، آئیاں ۔ جائیں ، جائیاں ۔ تھیاں اور جائیاں تھیاں

۱۲ (کے) کا حذف کر دینا جیسے اس کے پاس کی بجائے ۔ اس پاس ۔ اس کے آگے کی بجائے اس آگے۔

۱۳ (نے) کا استعمال بھی کیا جاتا ہے ۔ مرہٹی گجراتی ۔ برج ، ہریانی میں نے کا استعمال ملتا ہے۔

۱۴ نون غنہ کا استعمال جیسے

کو ۔ کوں ۔ کوچہ = کونچہ ۔ تو ۔ توں

۱۵ ماضی مطلق بنانے کے لئے امر میں (یا) بڑھا دینا جیسے ۔

مار سے ماریا بمعنی مارا ۔ بوجھ سے بوجھیا بمعنی بوجھا

۱۶ مستقبل کے لئے (سی) کا استعمال جیسے

جائیگا = جاسی ۔ آئیگا = آسی ۔ کھائیگا = کھاسی ۔ رہیگا = رہسی ۔

۱۷ فعل فاعل کا تابع ہوتا ہے جیسے ۔

عورت کی زبانی = میں نے روٹی کھالی ۔ مرد کی زبانی = میں نے روٹی کھایا ۔

۱۸ دو ہندی الفاظ یا ایک ہندی اور ایک فارسی کے درمیان واو عطف کا استعمال جیسے ۔

ناز و چھنو نین و دل ۔

۱۹ تذکیر و تانیث اور ساکن و متحرک کے سلسلہ میں کوئی خاص قاعدہ کی پابندی نہیں پائی جاتی ۔

۲۰ (ق) کا تلفظ (خ) دکنی کی خصوصیت ہے ۔ ڈاکٹر مسعود حسین خان نے اس کی توجیہہ یہ کی ہے کہ شائد یہ فارسی کے اثر کا نتیجہ ہے ۔ شہر سورت کے بعض محلوں کے لوگوں کی زبان میں خ کا رجحان پایا جاتا ہے ۔

دکنی کے چند ادبی نمونے بھی ملاحظہ کیجئے ۔

قلی قطب شاہ قطب

پیارے گرچہ میں تج بن نہیں تل رہنے سکتی ہوں
ولے لوگاں کے ڈر تھے سبھی اپس میں کونڈ رکھتی ہوں

چھپی چوری کدہیں مد میں یکٹ پاتی جو ہوں گیں تج
تو دیکھ تج مست ہو جیوں مُہر اُپں میں آپ ٹھمکتی ہوں

لگی تھی میں انا چلیتی گلے تج پھول سوں یک دن
تدھاں تھے سر تھے پاواں لگ اجھوں خوشبو مہکتی ہوں

مرا بس ہوئے آلٹ پلٹ ہو تج تیں جیو دینے میں
کہ فرصت نیں کروں کیا فکر اس غصہ تھے پکتی ہوں

تسوں میں بات کرتی تو تھی دو تن پیٹ سوں اس تھے
نہ پتیا چھانوں کوں اپنے کھڑی جاگا دَچکتی ہوں

دو تن کے جھوٹ کوں سچ مانتا توں یوں واجب نہیں
دو کیوں کے جھوٹ آ تج کوں ہری جا اس ہٹکتی ہوں

قطب شہ مست ہوں اس وقت پر توں بخش ہو منجکوں
نہ جانوں کیا کہتی ہوں میں نہ جانوں کیا بھڑکتی ہوں

(کلیات محمد قلی قطب شاہ)

کونڈ رکھنا = مقید رکھنا
کدہیں = کبھی
کیں = کہیں
مہر = مور

انا چلیتی = بے خبری
تدھاں = اس وقت سے
اجھوں = ابتک
پکتی ہوں = کڑھتی ہوں

دچکتی = دھچکتی
نہ پتیا چھانوں = بھروسہ کیا جائے
دو کیوں کے = وہ کیوں کہے

عبداللہ قطب شاہ

جگوئی تیری صحبت میں ہے سارا — وو برخوردار ہے ہر ٹیک ٹھارا
عجب تیری پرت کا مست مدہ ہے — کہ نیں مستی کوں اس کی کچ اتارا
ڈلارے کا ہوس تج ہے تو آ ڈل — کہ میرا دل سو ہے تیرا ڈلارا
ہر اک ترا پلک ہے رام کا بان — ہر اک سوکا ہے تیرا جیوں کٹارا
چتر سکے نہ تیرا روپ ہرگز — گر آویگا عطارد ہو چتارا
ہوئے قربان تیری تان پر سکے — طنبورا، سرمنڈل، جنتر، دوتارا
بنی صدقے تجے شاہ عبداللہ ہے — رلیا سوں ہر گھڑی ریجانہارا

(کلیات عبداللہ قطب شاہ)

ملا وجہی

جس یار کو میں منگتی ہوں وہ یار کہاں ہے
سرسوں سکی چل جاتی وے لے سار کہاں ہے
دل ہات میں تھے چھین لے کر نھاٹ گیا ہے
وہ یار دغا باز جھونٹے مار کہاں ہے
مشتاقی کے بازار میں میں بیچتی ہوں جیو
دلال کدھر ہور خریدار کہاں ہے

جگوئی = جو کوئی
برخوردار = عزت والا
ٹھارا = جگہ
مد = نشہ
ڈلنا = جھولنا
سوکا = سرمہ کی لکیر
چترنا = مصوری کرنا
چتارا = مصور
رلیا = ناز و ادا
ریجانہارا = فریفتہ کرنے والا

عاشق تو مج ایسے سکی لاکھاں ہیں ولیکن
معشوق سو اس دور میں اس سار کہاں ہے

دیدے مرے نادیدے جو دیدار دیکھے تھے
مُج صبر دِیونہار وہ دیدار کہاں ہے

(قطب مشتری)

عواصی

اگر تُج سا سروگیں ہور ہوتا
بنے بن بلبلاں کا شور ہوتا

کرم کے بہار میں نکلے سو نمیں تو
گھرے گھر غلغلہ در روز ہوتا

ندیسوں آج تھے دل کو رضا میں
کہ وہ تُج دیکھنے میں ہور ہوتا

جگوئی جو عشق آلاتا ہے تُج سوں
سو وو البتہ غمزے خور ہوتا

غواصی بخشتا تُج ناز کوں آج
جو اس کے حکم تل لاہور ہوتا

(بھار = باہر۔ زور = بہت۔ ندیسوں = نہ دینگے۔ حکم تل = اختیار یا قبضہ) (کلیات غواصی)

درس دے درس منج دکھاری کوں
دور کر دل کی بے قراری کوں

گر منگے گی تو لاک بار ہر روز
دیوں گا جیو تیری یاری کوں

تو رکھتی ہے کہ تج کوں بسریا میں
کوئی بسرتا ہے جیو کی پیاری کوں

کُج عجب نئیں بھلے فرشتا تو
تج ویسی بھلا نہاری کوں

بھر دے پیالے وو منجکوں پے در پے
توڑوں گا رات کی خماری کوں

دوں تری رنگ بھریاں سو انکھیاں پر
وارتا لاک ہوں تتاری کوں

جیوں ہے لگ کد ہیا کوں غواصی
چھوڑ دیا نہ تج ناری کوں؟

کہتی ہے = کہتی ہے۔ تتاری = تاتاری (کلیات غواصی)

سکی چل جاتی = جا سکتی تھی نہاٹ گیا = بھاگ گیا۔ اس سار = ایسا دِیونہار = دینے والا۔

گجرات میں ایک ایسا علاقہ ہے جہاں مسلمانوں کی سیاسی فتوحات کے بہت پہلے سے غیر زبانیں بولنے والے عرب اور ایرانی تجارت کی غرض سے آتے رہے اتنا ہی نہیں بلکہ بہتوں نے گجرات میں مستقل اقامت اختیار کر لی تھی اور وہیں پیوند خاک بھی ہوئے[1]۔ کھمبات، بھروچ، بھاربھوج۔ گندھارا، راندیر (سورت کے سامنے) تھانہ سوپارہ وغیرہ وہ مقامات ہیں جہاں غیر ملکیوں کی بڑی بڑی آبادیاں تھیں ساتویں صدی اور آٹھویں صدی عیسوی میں عربوں اور ایرانیوں کی اچھی خاصی تعداد سیاسی الٹ پھیر کی بنا پر اپنے اپنے ملکوں کو ہمیشہ کے لئے خیرباد کہہ کر گجرات اور دوسرے ساحلی علاقوں میں آکر آباد ہو گئی تھی۔ حضرت عمر فاروق رضؓ کے عہد میں پارسی قوم کے لوگوں نے بھی ہند کا رخ کیا تھا اور سب سے پہلے گجرات ہی کے ساحل پر لنگر انداز ہوئے تھے یہ لوگ اپنے ساتھ رائج الوقت ایرانی زبان بھی لائے۔ ۱۲ویں صدی عیسوی سے گجراتی ادب میں فارسی الفاظ کا استعمال پایا جاتا ہے۔ ۱۳ویں صدی کے دریافت شدہ گجراتی کتبوں میں بھی فارسی الفاظ ملتے ہیں۔ جین ادیبوں کی تخلیقات میں بھی فارسی الفاظ نظر سے گزرتے ہیں اور پندرہویں صدی تک تو فارسی الفاظ کا کافی رواج ہو چکا تھا[2]۔ معلوم ہوتا ہے ۱۵ویں صدی کے کچھ پہلے ہی سے جبکہ جدید گجراتی ادبی حیثیت سے رواج پا رہی تھی تو دوسری طرف اس کے مقابل میں گجری نے بھی ادبی شکل اختیار کرنا شروع کر لیا تھا۔ ۱۲۹۶ء میں علاؤالدین خلجی نے گجرات کو فتح کر کے سلطنت دہلی کا اس کو ایک صوبہ بنا لیا تھا۔

---

[1] آرکالوجیکل سروے از ضیاء الدین ڈیسائی [2] گجراتی پر فارسی کا اثر از ڈاکٹر فائک

اس وقت سے ۱۳۹۸ء / ۸۰۱ھ تک دہلی سے فوجی۔ فوجی افسر، غیر فوجی و اصلی[1] عہدیدار، تاجر، اہل حرفہ وغیرہ گجرات میں وارد ہوتے رہے۔ یہ لوگ اپنے اپنے ساتھ تہذیب، فارسی زبان دہلی کی مخلوط بولی وغیرہ بھی لائے اس دہلوی بولی میں ایسے عناصر موجود تھے جو گجری میں بھی موجود تھے لہذا دہلوی اور گجری کو شیر و شکر ہو جانے میں کوئی دقت نہیں ہوئی اور اس دو کے اختلاط سے بولی کا ایک نیا روپ ابھر آیا۔ اس روپ نے آگے چل کر ادبی شکل اختیار کر لی جو گجری کہلائی۔ گجری کی ترقی، اشاعت اور مقبولیت کے سلسلے میں سلاطین گجرات (۱۴۰۷ء / ۸۰۹ھ تا ۱۵۷۲ء / ۹۸۰ھ) کا دور بہت سازگار ثابت ہوا۔ اس سلطنت کا بانی خود ہندی نژاد تھا سلاطین اس بولی کے دلدادہ تھے۔ ان کے دیئے ہوئے نام گھٹا منڈل (محلات کا مجموعہ)، شبہ رائی (رانی کا نام) سنکل کوٹ (دیوبندر گاہ میں زیر آب زنجیروں کی حد بندی) اللہ دتیی (پالتو بکری کا نام) وغیرہ ان کے رجحان طبع کے غماز ہیں۔ اسی دور حکومت میں گجری میں مستقل تصانیف کا آغاز ہوا تھا۔

پندرہویں صدی میں گجری کا روپ بعض صوفیا کی زبان سے نکلے ہوئے اقوال اور فقروں کی صورت میں دیکھا جا سکتا ہے مثلاً قطب عالم ۱۴۵۳ء / ۸۵۷ھ سے منسوب ہیں۔ اے بے چھرا بے ادبی و گستاخی مکن۔ کیا ہے لوہا ہے لکڑی کہ پتھر ہے تساں نیسے دوھوں۔

شاہ عالم بن قطب عالم ۱۴۷۵ء / ۸۸۰ھ = دیوا بڑھاؤ۔ ڈوکرے۔ ارے میاں الو لک بولے کیوں نہیں۔ راجن جی پکروٹے بدل پکروٹا اس عہد میں گجری اتنی مقبول ہو چکی تھی کہ ایک مسجد کا کتبہ بھی گجری میں ملتا ہے۔

---

[1] رسالہ اردو بابتہ ــــ اپریل ۱۹۳۸ء

فساد میں سمجھائکر باندھے شاہجی پال = بانو مسجد کے تئیں صحبت ملک جلال
تاریخ اس مسیت کی ہوئی سولیوں مشہور = مسجد جامع کے بیچ وٹھایا یہ نور

گجری ادب کے بارے میں خاطر خواہ تلاش و تحقیق کا کام نہیں ہو پایا ہے۔ گمان غالب ہے کہ قدیم شہ پارے ابھی پردۂ خفا میں ہیں یا دست برد زمانہ کے نذر ہو چکے ہیں اب تک جو تصانیف منظر عام پر آ چکی ہیں ان کے پیش نظر شیخ بہاؤالدین باجن ۹۱۲ھ قاضی محمود دریائی بیر پوری ۹۴۳ھ، علی جیو گام دھنی ۱۰۲۴ھ خوب محمد چشتی ۱۰۴۳ھ گجری کے دور اولین کے مصنفین قرار دیئے جاتے ہیں ان بزرگوں کی تخلیقات لسانی نقطۂ نظر سے بہت اہمیت رکھتی ہیں۔

گجرات میں اس دور اولین کے ادب کی چند اہم خصوصیات یہ ہیں :-

۱ مقامی زبان کے الفاظ اور صرفی و نحوی ترکیبیں جیسے۔

جویاں = دیکھے۔ سیری = کوچہ۔ لیکھے = سمجھے۔ دیٹھا = دیکھا۔
سادہ = آواز۔ آنوں = لاؤں وغیرہ۔

۲ فارسی محاوروں کا اردو ترجمہ جیسے

دب کرنا = دفن کردن محبت کرنا یار کھنا = محبت داشتن
رقصنا = رقص کردن وغیرہ۔

۳ عربی فارسی الفاظ اور مذہبی اصطلاحات کے علاوہ بعض فارسی عربی الفاظ کا مقامی لب و لہجہ میں ادا کرنا جیسے

نگہبان = نگہبان۔ درس = درست۔ زلیچہ = غالیچہ۔ مسیت = مسجد۔

۴ بعض عربی فارسی الفاظ کا املا جیسے

نسخا = نسخہ۔ رازی = راضی۔ صحی یا سہی = صحیح وغیرہ۔

۵۔ واؤ عطف کے بجائے ضم سے کام لینا جیسے
ارضُ سما = ارض وسما۔

۶۔ ضمائر جیسے
ہون = میں۔ تمتیں = تم۔ تمن = تم۔ ہمن = ہم۔ تمنا = تمہارا۔ وغیرہ

۷۔ جمع بنانے کے طریقے ۱ یا اور یاں بڑھاکر ۲ برج کے مطابق جیسے
۱ آنکھ = انکھیاں۔ لوگ = لوگاں۔
۲ درویش = درویشنہ۔ راتیں = راتنہ

۸۔ جمع مضارع کریں، دھریں وغیرہ کے علاوہ برج کی ترکیب پر
جاگیں = جاگنہ۔ مانگس = مانگنہ۔

۹۔ 'سے' کے لئے تھے یا تھی۔ اور 'جو' کے لئے 'جے'۔ ہے = اہے
یہی = ایہی۔ جب = جد۔ اب = ہب۔

۱۰۔ مستقبل کے لئے سی کا استعمال۔ جیسے
کریگا = کرسی۔ جائیگا = جاسی۔ رہیگا = رہسی۔

۱۱۔ ساکن و متحرک، تذکیر و تانیث کے لئے کسی قاعدہ کی پابندی نہیں۔

۱۲۔ 'نے' کا استعمال کئی طریقوں سے کیا گیا ہے۔
'نے' کے لئے لیے یا اپے۔ جیسے محمود نے کھایا = محمودے کھایا۔
'نے' 'اور' کے معنی میں جیسے احمد اور محمد = احمد نے محمد۔
'نے' اصرار کے لئے جیسے آؤنا = آؤنے۔
'نے' 'کر' کے معنی میں جیسے لگ کر = لگنے۔ چلکر = چلنے۔
'نے' 'کو' کے لئے جیسے احمد کو = احمد نے

۱۳ (ڈ) کا رجحان جیسے

پڑھو = پڈھو ۔ آرے = آڈے ۔ گاڑی = گاڈی وغیرہ ۔

اس دور کے کلام کا نمونہ یہ ہے :۔

باجن:۔ ترے پنتہ کوئی چل نسکھے جو چلے سو چل چل تھکے

پڑہ پنڈت پوتھی دہویاں سب جان سدہ بدہ کھویاں

سب جوگیوں جوگ بسارے سہ تلپئی تب بکارے

ایک درسنی درسن بھولی سر ننگے پانوہ کھلے

ایک سیوری ہوئے سیو کرنہ ہوئی تلپئی کیا دُکہ دھرنہ

ایک درویش ہوئے کر آئے ہوئی قلندر روپ بھرائے

ایک ابدال ہوئے اب دھوتی ایک ہندہ ہا ہا ہوتی

ایک راتی ماتی ہوئے اردادنہ (بن) پی پے سدہ ہو ہو جادنہ

ایک سنگم جٹا دھاری ہور ہندوشن اندھیاری

ایک کاپری ہوی کر کپنہ منہ سیو تجھے چلنہ

ایک اپاسی راتنہ جاگنہ ہوے بھکاری تجھے مانگنہ

یوں ٹولی ٹولی ہوے کرے سہ رل رل کہل کہل کہوی کرے

دے مکت منے ایوے دیکھے ارے باجن توکس لیکھے

سیوری = جین مت کے تارک الدنیا۔

دھرنہ = دھریں ۔ جادنہ = جائیں۔

راتنہ = راتوں ۔ کس لیکھے = کس خیال میں ہے۔

محمود دریائی

جا پوچھو پیو کس ٹھانا ں — میں پیو منہ پیو منجہ مانہاں
دودھ مان گھی جو انہاں — یو پیو جیو من مانہاں
جی کو تن اپنا لے تاوے — اس پر کٹ پیو دکھلاوے
کچھ پیو تہیں الگانا نہیں — مجھ لیکھن یوں من مانہیں
جی کو مرم سودھا پاوے — سب الجھن اس کی جاوے
قاضی محمود اتنا مانے — میٹھی پیو کوں الگا نجانے
بہت بات ایک آکھی — وی جھوٹ نہیں چکہ ساجی

علی جیو:-

مکاشفہ

نکتہ اول. آپیں کھیلوں آپ کھلاؤں — آپیں اپس لیکل آؤں
" دوم. میرا ناؤں منجے اتی بھاوے — میرا جیو منجی پر جاوے
میری نیہ منجے سوں ... ؟ — دھری اپنیں روپ لبھائے
" سوم. لاگا نیہ سو منجہ سوں میٹھا — جد کا سودھن اپن دیٹھا
جیکو اپیں روپ لبھاوے — سہی سو کیوں نہ آپ سہراوے
" چہارم. میں منجہ دھریا نانو سنکھا تھے — شاہ علی جیو ہے منجہ ساتھے
منجہ بن کوئی نہیں حکما نہاں — جیری سہاگن ہوں تس نانہاں

لیکل = نکل - اتی = بہت - جدکا = جب سے - جیکو = جس کو - سنکھا تھے = ساتھ
منہ = ماں - تاوے = گرمائے - آکھی = پوری. سالم.
مانہاں = میں - الگا = الگ - اس پرگٹ = اس طرح - مرم = جذبات

خوب محمد چشتی۔

حکایت مرتبہ خلافت

جیوں محمود سو تہاں سُلطان — عبد ایاز تخت فرمان
اس پر حکم کیا کہ آج — ہوں بندا توں ہیں سو راج
تخت ایاز سو بیٹھا جای — سوی کرے جی وہ فرمای
چل محمود ین کیا سلام — کہیا کہ ھوں تجہ آج غلام
حاکم بھی محمود سو سب — جب سلطان عبد بھی جب
جد محمود عبد کی شان — عشق کہے پورا سلطان
تخت ایاز سو بیٹھا جانہ — حاکم نت محمود اوں ٹھانہ
حکم اس پر کیا جب — تخت ہیں جا بیٹھا تب
انہیں قبولیا حکم تمام — تخت بیٹھیں ہوا غلام
حکم سو حاکم کا اس ٹھانہ — ہے محکوم غلامی مانہ
حاکم شخص سو ہے معبود — چھانہ محکوم ہوئی مسجود
اینہا خلافت پائی تمام — ہوئی سلطان جو عین غلام

آخر میں ولی کے کلام کی لسانی خصوصیات ملاحظہ کیجئے:۔

۱۔ مصدر کے آخر میں 'ی' کا اضافہ جیسے خمار سے خماری۔ انتظار سے انتظاری نسیان سے نسیانی وغیرہ۔

حافظے کا حسن دکھلاتا ہے نسیانی مجھے
خماری دیکھ تجھ انکھیاں کی بے کیف

نہ کر تغافل اے مصر حسن کے یوسف
شتابی آ کہ جی تجھ پہ کروں اسپند اے ظالم

۲ ماضی جیسے سنا سے سنیا۔ پڑا سے پڑیا وغیرہ

سنبل پڑیا ہے دام میں تجھ زلف کے اے گل بدن
آزاد سوں سنیا ہوں یہ مصرع مناسب
میں جیو کوں رکھیا عشق کے بازار میں لیکن

۳ اکثر 'نے' اور 'کی' وغیرہ کا حذف

میں اپنے دل کی تجکوں حکایت نہیں لکھی
مشرب مجنوں طرف منسوب ہے

۴ مجھ اور تجھ کا استعمال بجاے میرے تیرے

تجھ حسن کا جب سوں غلغلہ ہے
تجھ زلف کی شکن نے دیا مجھ شکستگی
جس روز مجھ آغوش میں وہ سیم تن آوے

۵ 'ر' اور 'ل' کا تبادلہ جیسے تلوار سے تروار، بانسری سے بانسلی وغیرہ

سر نگاہِ تیز اس کی تیر ہے تروار ہے
ہر استخواں میں میرے آواز بانسلی ہے

۶ فعل کا فاعل کے مطابق ہونا جیسے

جب سوں تیرے جمال پہ مہ نے نظر کیا
کیا ہوا توں کیا کتاباں جمع
دیا ہے لطف سوں تجھ کوں خدا نے حسن کی دولت

۷ نون غنہ کا استعمال جیسے

اس نے = اس نیں ۔ کو = کوں ۔ سے = سیں وغیرہ

۸ فارسی اور ہندی الفاظ کے درمیان واو عطف جیسے

بیڑہ پان ۔ ناز و چھب وغیرہ ۔

۹ بعض حروف کا حذف جیسے

سینے = سنے ۔ پریت = پرت ۔ پھیکا = پھکا ۔ لوٹا = لٹا ۔ نزدیک = نزک ۔ ٹھاٹ ۔ ٹھٹ ۔ سورج = سُرج ۔ کوئی = کُئی ۔ آگے = اَگے ۔

۱۰ ملفوظ 'ہ' کا جاتا رہنا جیسے

وہاں = واں ۔ کہتا = کے تا (کیتا) ۔ کہوں = گوں وغیرہ ۔

۱۱ بعض الفاظ جیسے

پاس = کنے ۔ آنسو = انجھواں ۔ چھینٹا = چیرا ۔ کہاں = کیدھر ۔ کبھی = کبھو جدھر = جیدھر ۔ کتنے = کتے ۔ اتنا = اِتا ۔ میں = منیں تفصیل = بستار ۔ نین = انکھ ۔ جلوہ = درس ۔ نہیں = نئیں ۔ اچھے (ہے ۔ ہو) کی مُرَ آئے = آوے ۔ سجن ۔ سریجن ۔ دسنا = نظر آنا ۔ کیتا بمعنی کیا ۔

۱۲ 'کر' اور 'کرکر' کا استعمال ۔

مروت دوستاں دشمن کو دم دشمن کر نہیں گنتے

۱۳ ضمائر تمنا ۔ تمن ۔ ہمنا وغیرہ پائے جاتے ہیں مگر شاذ ۔

۱۴ بعض گجراتی الفاظ جیسے

آنو = آنول ۔ اڑکنا = لگنا ۔ تصویر بنانا = چترنا ۔ لانبا رومال = پٹکا رنج دکھ = آل متعجب ہونا = اچرج ۔ ٹوٹنا = جوکھنا ۔ سیلاب = پور

خوشی = ہلاس۔ بھاگنا = ناٹھنا۔ نکالنا = کاڑنا۔ گجگری کی چوڑیاں = ہاتھی دانت کی۔ کنگن کی وضع = کریلا دھار۔

دہلوی، گجری اور دکھنی کی لسانی خصوصیات کے مطالعہ سے یہ واضح ہوگیا ہوگا کہ تینوں شاخوں میں بیشتر خصوصیات مشترک ہیں۔ ایک ہی ماں کی بیٹیاں اپنے اپنے مختلف ماحول اور صحبت کی اثر کی وجہ سے ایک دوسرے سے الگ معلوم ہوتی ہیں ورنہ ان کی اصل ایک ہی ہے۔ ہر ایک شاخ کا لب ولہجہ بھی ان کے ایک دوسرے سے مختلف ہونے کے تصور کا سبب ہے

ولی کا کلام انہیں خصوصیات کا مجموعہ ہے۔ اس کے کلام میں بعض غزلیں خالص گجری یا دکنی خصوصیات لئے ہوئے ہیں اور بیشتر تخلیقات میں یہی خصوصیات ملی جلی پائی جاتی ہیں۔ اس نے لسانی اعتبار سے کثرت میں وحدت کا کرشمہ دکھایا اور اُردو ادب میں آگے بڑھنے کے لئے راہیں کھول دیں۔

اِس موقع پر ولی کے کلام کے مطالعہ سے قبل ولی کے دور میں گجری کا جو روپ رواج پاگیا تھا اس کو بھی ایک نظر دیکھتے چلیئے:۔

کلام پیر مشائخ (احمد آبادی) سنہ ۱۰۶۰ھ تا سنہ ۱۱۲۱ھ

کہ جو تمیں نبی ہو سچے رے کہلائے — آنے نبوت کیرا دعویٰ ہو کرائے
تو چاند کے ٹکڑے آج دوے کراؤ — یہ معجزہ ہمکوں ساچا رے دِکھاؤ
تب نبی جی نے اتنا آپ پوچھا رے جاناں — یوں ہو تو سگلے تم لاؤ رے ایماناں
تب قبول رے کیتا جے تی آئی لوڑی — ہم لاویں گے ایمان بولے سب رے بولی

(جتنی) وغیرہ

مسکین (سورتی) سنہ ۱۰۹۲ھ از جمجمہ (کھوپڑی)

تم اسے پوچھو گے جو اسکا احوال — کھوپڑی سب کھول کھیگی اپنا حال
حضرت عیسیٰ نی نزدیک جا — کھوپڑی کوں حال اوسکا پوچھیا
رب کی سوگند ہے تجھے اے کھوپڑی — حال اپنا کہہ مجھے یہاں کیوں پڑی
حال تیرا کس روش تھا از اوّل — خوبصورت تھا وہ یا کہ بدشکل
بادشاہ تھا کہ تیں مردِ گدا — مرد دولت مند تھا یا بی نوا
ہُوا ہے جنّتی یا دوزخی — کَوْن (کہ) نجیل انھاتوں کہ یا مرد۔ سخی
کھوپڑی بولی یہ عیسیٰ سوں سخن — مرد گھنہ ہو گئی مج کئی قرن (بہت وغیرہ)

محمد امین۔ از یوسف زلیخا سنہ ۱۱۰۹ھ

جو بالوں اُدپر تھا مُشک کا رنگ — ملے وے بال سب کافور کے سنگ
نَینْ دونو تھی روشن جو چندر سور — اُنو کی جوت سنگلی ہو گئی دور
انھا مکھڑا جو رنگ ارغوانی — ہوا وے درد سوں مکھ زعفرانی
کرے جس وقت وے مکھ سیتی بات — دُھوجے ٹھوری سوئیوں جو جھاڑ کا پانت
دھوجارا پڑ گیا ھاتھوں پگوں یں — دَرَدْ ظاہر ھوا سگلے رگوں میں (رعشہ۔ لرزہ)
وے یوں عاجز تھی اپنے حال سیتی — آنے خالی تھی زر اور مال سیتی (اور وغیرہ)

نصیر الحق (جوناگڈھ) قصہ بی بی خدیجہ سنہ ۱۱۵۲ھ

بی بی نے ایلچی بھیجا نبی کن — چلو گھر شاھزادی کریا جشن
بلائی ھیں تموں کوں از محبت — تموں کارن بھوت کینچھی مشقت

کہا صدیق کوں حضرت نے دلخواہ — چلو بی بی کے گھر مجسوں ہو ہمراہ
چلو خاطر میں ہوں از جان و دل — کروں قربان تم پر جان تن کوں
کیا حضرت نبی اپس کوں سنگار — قمیص مصری بھوت قیمتی دستار
رکھا دستار میں زرّیں سو طرّا — چلے صدیق کوں لے آپ ہمراہ
چنبیلی پھول کا سہرا سو باندھے — زرّیں بوٹوں کی ناکھے شال کاندھے
وغیرہ

دکنی رنگ

تو اب ہے جو سینہ شاد دستا — مطلب ہے کہ بامراد دستا
تجھ مکھ کے صدقے یہ نقطۂ خال — سرمایۂ ہر مراد دستا
ہر نسخۂ لذت جہاں کا — انکھیاں میں تری سواد دستا
ابرو کے نزک یہ خال موزوں — خوش مصرع مستزاد دستا
تیری یہ جبینِ باصباحت — مجھ جلوۂ بامداد دستا
تجھ نین کی کیا کروں میں تعریف — یہ عین ثلث کا صاد دستا

عالم میں ولی سخن یو تیرا
مجھ فائدہ فواد دستا

(۵۴)

تیرے شکر لب کو اب مثل عسل بولنا — بلکہ عسل ہے نقل اس کوں اصل بولنا
تجھ قد و قامت آگے سرو ہوا سرنگوں — تجھ سے رواں ہر اگے سرو کو شل بولنا
مکھ کی صدف پہ تری دُر ہے مبارک سچن — دُرِ سمندر اسے سب کی عقل بولنا
بات کی مجلس منیں میرا سخن تو نچھ ہے — جگ میں مسیحا تھے جب سوں سیل بولنا

مور ضعیف ہے ولی خاک، قدم بجا رکھ
بلکہ صعیفی منیں اس نہیں بل بولنا

سجن تجھ بن ہمن گلشن کوں گلشن کر نہیں گنتے
بہ جز تیرے یہ روشن کوں روشن کر نہیں گنتے

سکندر کیوں نہ جاوے بحر حیرت میں کہ مشتاقاں
تمہارے مکھ اگے درپن کوں درپن کر نہیں گنتے

نہیں تیرے رقیباں سوں عداوت دل میں ہمناکے
مروت دوستاں دشمن کوں دشمن کر نہیں گنتے

اگر انچھواں کے گوہر سوں مکمل نیں ہوا دامن
محبت مشرب اس دامن کوں دامن کر نہیں گنتے

ولی دل میں ہمارے حاسداں کا خوف نہیں ہرگز
بجز دزدی کسی رہزن کوں رہزن کر نہیں گنتے

اب ولی کا کلام دیکھئے

شغل بہتر ہے عشق بازی کا
کیا حقیقی و کیا مجازی کا

ہر زبان پر ہے مثل شانہ مدام
ذکر اس زلف کی درازی کا

ہوش کے ہاتھ میں عناں نہ رہی
جب سوں دیکھا سوار تازی کا

تیں دکھا کر اپس کے مکھ کی کتاب
علم کھویا ہے دل سوں قاضی کا

آج تیری نگہ نے مسجد میں
ہوش کھویا ہے ہر نمازی کا

گر نہیں راز فقر سوں آگاہ
فخر بے جا ہے فخر رازی کا

اے ولی سرو قد کوں دیکھوں گا
وقت آیا ہے سرفرازی کا

دل کو گر مرتبہ ہے درپن کا
مفت ہے دیکھنا سری جن کا

جامہ زیبوں کوں کیوں نجو کہ مجھے
گھیر رکھتا ہے دور دامن کا

اے زباں کر مدد کہ آج صنم — منتظر ہے بیان روشن کا
حکمت عشق بو علی سوں نہ پوچھ — نہیں قانون شناس اس فن کا
آئینہ تجھ سے ہو کے ہم زانو — حیرت افزا ہوا ہے گلشن کا
امن میں تجھ نگہ سوں ہیں بے ڈر — خوف نہیں مفلساں کو رہزن کا
دل صد پارہ تجھ پلک سوں ہے بند — خرقہ دوزی ہے کام سوزن کا
تجھ نگہ سوں بہ شکل شان عمل — دل ہوا گھر ہزار روزن کا
ہے مرے شعر میں تو فیض اسے — جو کرے ورد اسے اپس من کا

ٹک ولی کی طرف نگاہ کرو
صبح سوں منتظر ہے درشن کا

جب صنم کو خیال باغ ہوا — طالبِ نشۂ فراغ ہوا
فوج عشاق دیکھ ہر جانب — نازنیں صاحب دماغ ہوا
رشک سوں تجھ لباں کی سرخی کے — جگر لالہ داغ داغ ہوا
دلِ عشاق کیوں نہ ہوں روشن — جب خیال صنم چراغ ہوا

اے ولی گلبدن کوں باغ میں دیکھ
دلِ صد برگ باغ باغ ہوا

فدائے دلبر رنگیں ادا ہوں — شہید شاہد گلگوں قبا ہوں
ہر اک مہ رو کے ملنے کا نہیں شوق — سخن کے آشنا کا آشنا ہوں
کیا ہوں ترک نرگس کا تماشا — طلب گارِ نگاہِ باحیا ہوں

نہ کر شمشاد کی تعریف مجھ پاس — کہ میں اس سرو قد کا مبتلا ہوں
کیا میں عرض اس خورشید رو سوں — تو شاہ حسن میں تیرا گدا ہوں
سدا رکھتا ہوں شوق اسکے سخن کا — ہمیشہ تشنۂ اب لقا ہوں

قدم پر اس کے رکھتا ہوں سدا سر
ولی ہم مشرب رنگِ حنا ہوں

خوب رو خوب کام کرتے ہیں — یک نگہ میں غلام کرتے ہیں
دیکھ خوباں کوں وقت ملنے کے — کس ادا سوں سلام کرتے ہیں
کیا وفادار ہیں کہ ملنے میں — دل سوں سب رام رام کرتے ہیں
کم نگاہی سوں دیکھتے ہیں ولے — کام اپنا تمام کرتے ہیں
کھولتے ہیں جب اپنی زلفاں کوں — صبح عاشق کوں شام کرتے ہیں
صاحب لفظ اس کوں کہہ سکیے — جس سوں خوباں کلام کرتے ہیں

دل بجاتے ہیں اے ولی میرا
سرو قد جب خرام کرتے ہیں

آج سرسبز کوہ و صحرا ہے — ہر طرف سیر ہے تماشا ہے
چہرۂ یار و قامت زیبا — گل رنگیں و سرو رعنا ہے
معنی ناز و معنی خوبی — صورت یار سوں ہویدا ہے
دمِ جاں بخشِ نوخطاں مجھ کوں — چشمۂ خضر ہے مسیحا ہے
کمرِ نازک و دہانِ صنم — فکر باریک ہے معمّا ہے

مو بہ مو اس کوں ہے پریشانی — زلف مشکیں کا جس کوں سودا ہے
کیا حقیقت ہے تجھ تواضع کی — یو تلطّف ہے یا مدارا ہے
سبب دل ربائی عاشق — مہر ہے لطف ہے دلاسا ہے
رات دن جوں ولی ہے محو خیال — جس کوں تجھ وصل کی تمنا ہے

مفلسی سب بہار کھوتی ہے — مرد کا اعتبار کھوتی ہے
کیوں کہ حاصل ہو مجھ کوں جمعیت — زلف تیری قرار کھوتی ہے
ہر سحر شوخ کی نگہ کی شراب — تجھ انکھاں کا خمار کھوتی ہے
کیوں کہ ملنا صنم کا ترک کروں — دلبری اختیار کھوتی ہے
اے ولی اب اس پری رو کی — مجھ سنے کا غبار کھوتی ہے

کماں ابرو پہ قربان ہوا ہے — دل اس تیر کا پیکان ہوا ہے
بھواں تیغ و پلک خنجر نگہ تیر — یو کس کے قتل کا سامان ہوا ہے
مرا دل مجھ سوں کر کے بے وفائی — پسند خاطر خوباں ہوا ہے
پیا ہے جام دل سوں بادۂ خوں — جو بزم عشق میں مہماں ہوا ہے
عزیزاں کیا ہے پروانے کے دل میں — کہ جی دینا اسے آساں ہوا ہے
طبیباں کا نہیں محتاج ہرگز — جسے درد بتاں درماں ہوا ہے
برنگ گل فراقِ گل رخاں میں — گریباں چاک تا داماں ہوا ہے
سوادِ خطِ خوباں دل کشی میں — بہارِ گلشن ریحاں ہوا ہے
ولی تصویر اس کی جن نے دیکھا — مثال آرسی حیراں ہوا ہے

خوش قداں دل کوں بند کرتے ہیں
نام اپنا بلند کرتے ہیں

اپنے شیریں سخن کوں دے کے رواج
سرد بازارِ قند کرتے ہیں

جس کوں بے تاب دیکھتے ہیں اسے
اپنے اوپر سپند کرتے ہیں.

بند کرنے کوں عاشقاں کے سدا
زلف اپنی کمند کرتے ہیں

اے ولی جو کہ ہیں بلند خیال
شعر میرا پسند کرتے ہیں

چند اشعار بھی ملاحظہ کیجیے :-

موج بے تابیٔ دل اشک میں ہوئی جلوہ نما
تب لبھی زلفِ صنم طبع پریشاں میں آ

آہ پر آہ کھینچتا تھا میں
آج کی رات کچھ حساب نہ تھا

گل ہوئے غرقِ آبِ شبنم میں
دیکھ اس صاحبِ حیا کی ادا

یہاں بیم کے دریا میں گرداں ہے کشتیٔ عقل
اس موج شعلہ زن میں کیا ہے آسرا خس کا

باعثِ نشۂ و بالا ہے
حسن صورت کے ساتھ حسن ادا

پھر میری خبر لینے دو صیاد نہ آیا
شاید کہ مرا حال اسے یاد نہ آیا

نہ جانوں خط ترا کس بے خطا پر
چلا ہے آج فوج شام لے کر

اس مکاں سے تو بھاگ اے دانا
جس مکاں میں ہوئے ہیں نادان جمع

لب تمہارے شفا بخش ولی ہے بیمار
حیف درحیف کہ اسوقت میں درماں نہ کرو

بات کہنے کا کبھی جو وقت پاتا ہے عجب
بھول جاتا ہے وہ سب کچھ دیکھ صورت یار کی

زلف تیری ہوئی ہے چرب زباں
حفظ کر کر قصیدۂ لامی

ساقی و مطرب آج ہیں ہم رنگ
نشۂ بے خودی دوبالا ہے

کیا کروں تفسیر غم ہر اشک چشم
راز کے قرآں کا کشاف ہے

دشمن دیں کا دین دشمن ہے
راہزن کا چراغ روشن ہے

دہلوی گجری اور دکنی شاخوں کی اہم لسانی خصوصیات اور ادبی نمونوں کے مطالعہ کے بعد یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ ولی کی زبان کثرت میں وحدت کا تماشا ہے ولی کی اس کرامت نے محققین کے لئے قیاس آرائیوں اور تاویلوں کے دروازے کھول دیئے۔ بعض ولی دوستوں کا خیال ہے کہ ولی کی زبان دکنی ہے کیونکہ اس میں دکنی خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ بعضوں نے اس کے کلام کی صاف ستھری زبان کے پیش نظر یہ رائے قائم کرلی کہ ولی نے اورنگ آبادی محاورہ میں شاعری کی ہے کیونکہ اس عہد میں اورنگ آبادی محاورہ دکنی سے قدرے صاف اور شمال کے محاورہ سے قریب تھا۔ یہ بھی قیاس کیا جاتا ہے کہ اس کے استاد شاہ گلشن کے مشورہ کے بعد ولی نے شاہجہاں آبادی محاورہ میں شعر کہنا شروع کیا۔ بعض تذکرہ نگاروں کے بیانات سے پتہ چلتا ہے کہ ولی کے کلام نے شمال میں پہنچنے کے بعد مقبولیت حاصل کی۔ ۱۱۱۲ھ میں ولی نے دہلی کا سفر کیا اور ۱۱۱۸ھ میں وفات پائی۔ سفر دہلی کے بعد وہ چھ سات سال زندہ رہا۔ اس مدت میں اس نے کتنا کلام یادگار چھوڑا جس کو شاہ گلشن کے مشورہ کا نتیجہ کہا جاسکتا ہے۔ یہاں یہ سوال بھی غور طلب ہے کہ ولی کے سفر دہلی سے پیشتر اس کا کلام شمال میں پھر کیسے مقبولیت حاصل کرپایا۔ جب ولی نے اورنگ آبادی محاورہ میں تخلیقات پیش کیں تو شاہ گلشن کو مشورہ دینے کی کیوں ضرورت پیش آئی۔

دہلوی، گجری اور دکنی کی لسانی خصوصیات کے مطالعہ سے یہ بھی واضح ہے کہ تینوں شاخوں میں بیشتر خصوصیات مشترک ہیں، انداز فکر، انداز بیان لب و لہجہ اور بعض مقامی الفاظ اور محاوروں کی وجہ سے شاخیں ایک دوسرے سے مختلف پائی جاتی ہیں لہذا تخلیقات پر دہلوی، گجری یا دکنی کا ٹھپہ لگ جاتا ہے

ولی زبان و ادب کا مزاج شناس تھا وہ جتنا لجہ کے خمیر سے واقف تھا
اتنا ہی دکنی اور اورنگ آبادی شاخوں کے محاسن و معائب سے بھی آگاہ تھا۔
اس نے زبان کی تنگ دامانی اور خامیوں کا اندازہ کر لیا۔ اور موضوعات غزل
کے پیش نظر زبان کی کوتاہیوں کو دور کرنے کی غرض سے مروجہ ادبی زبان میں
اجتہاد سے کام لیا۔ اس اجتہاد کی وجہ سے زبان کی ایک شائستہ و پاکیزہ شکل
سامنے آگئی۔ اس پاکیزہ زبان میں ولی کے فن و کمال نے شاعری کا ایسا گرشمہ
پیش کیا جو شمال و جنوب میں پسند خاطر ٹھہرا۔

ولی کے کلام میں چند غزلیں خالص دکنی زبان اور لب و لہجہ میں پائی جاتی
ہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ ولی نے اپنے سفر دکن کے موقع پر دکنی زبان میں
چند تخلیقات پیش کر کے اپنی قادر الکلامی کا ثبوت دیا ہے تو بیجا نہ ہوگا۔ اس کو
ولی کے ابتدائی دور کا ایک ادبی تجربہ بھی کہا جا سکتا ہے۔

ولی کا فنِ اجتہاد

ولی نے غزل کو اپنایا۔ اس کی طبیعت کا اقتضا ہی یہ تھا۔ غزل حسن و عشق سے تعلق رکھتی ہے یہ صحیفۂ دل کی تفسیر ہوتی ہے۔ لہٰذا عارفانہ سرمستیوں کے اظہار کے لئے یہ ایک مناسب صنف سخن ہے۔ ولی کو اظہار جذب و شوق کے علاوہ اپنی جدّت طبع کی جولانیاں اور آزادیٔ فکر کے کرشمے دکھلانے کے لئے بھی ایک میدان کی ضرورت تھی۔ اس زمانہ کا ادب یہ ظاہر کرتا ہے کہ صنف غزل میں یہ تقاضے پورے ہو سکتے تھے۔ ولی نے جب اس میدان میں قدم رکھا اس وقت دکن میں اردو ادب اپنے سنہرے دَور کی آخری منزل پر تھا۔ وجہی، نصرتی غواصی ابن نشاطی اور دوسروں نے صنف مثنوی کو بلند مقام پر پہنچا دیا تھا۔ درباروں سے تعلق رکھنے والے شعرا نے صنف قصیدہ کو بھی آگے بڑھا دیا تھا۔ شیعیت کے رجحان نے مرثیہ گو بھی پیدا کر دیئے تھے۔ شاہی توجہ نے غزل کو بھی پنپنے کا موقع دے دیا تھا۔ گجرات بھی شعرا سے خالی نہیں تھا۔ لیکن یہاں کی ادبی سرگرمیاں مذہب تک محدود تھیں۔ مذہبی اخلاقی مثنویاں پہلے بھی لکھی گئیں اور اس دور میں بھی ان کا سلسلہ جاری تھا۔ ادب نے مجموعی حیثیت سے ارتقائی مدارج ضرور طے کئے مگر زمانہ بدل رہا تھا۔ پرانے تصورات اور رجحانات فرسودگی کی

وجہ سے آمادۂ زوال تھے۔ زبان کے دھارے میں ایک قسم کا ٹھہراؤ آگیا تھا۔ ادب ایک محدود دائرہ میں چکر کاٹ رہا تھا۔ ولی ادب کا بڑا نبض شناس تھا۔ اس نے ان تمام اسباب کو معلوم کر لیا۔ اور انہیں اسباب کی وجہ سے سلاطین کی توجہ کے باوجود یہ صنف مقبولیت حاصل نہ کر سکی تھی۔ ولی نے غزل کو اپنا کر بڑی دور بینی کا ثبوت دیا۔ اس طرح ایک پنتھ دو کاج ہوئے اور یہ صوفی شاعر اپنے زمانہ کا فنکار مجتہد ثابت ہوا۔

آج تک غزل کی جتنی مذمت ہوتی رہی اتنا ہی اس کے محاسن منظر عام پر آتے گئے۔ اور ادب سے جتنا خارج کرنے کی کوشش کی گئی اتنی ہی یہ دلوں میں گھر کرتی گئی۔ صنف غزل بذات خود خراب نہیں۔ لیکن چونکہ یہ صدیوں سے سرد و گرم میں سے گزرتی چلی آرہی ہے لہٰذا کہیں شباب سے اس کا چہرہ گلنار نظر آتا ہے اور کہیں زمانہ کی تیز و تند ہواؤں سے جھلسا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ بایں ہمہ اس کے اصل جوہروں میں فرق نہ آنے پایا۔ اور اس کی معنوی قدروں کو کوئی نقصان نہیں پہنچا بہ حیثیت صنف غزل کا درجہ بلند ہے۔ اسے جتنا آسان سمجھا جاتا ہے۔ اتنا نہیں ہے۔ اس کے برتنے والوں کی جتنی تعداد زیادہ ہے۔ فنکار غزل گویوں کی تعداد اتنی ہی کم ہے۔ یہ کہنا نامناسب نہ ہوگا کہ صحیح معنوں میں ہر دور میں دو چار ہی غزل گو پیدا ہوتے ہیں۔

فطرتِ انسانی ملکی صفات اور بہیمانہ خصائل کا مجموعہ ہوتی ہے عقل و خرد ایک چابک ہے جس سے ان دونوں کو قابو میں رکھا جاتا ہے۔ جو انسان محض صفات ملکوتی کو زیادہ کام میں لیتا ہے وہ فرشتہ کہلاتا ہے اور جو شخص خصائل،

بہیمی کی طرف راغب ہوتا ہے اس سے بہیمیت کے افعال سرزد ہوتے ہیں اور جو شخص ان میں توازن قائم رکھتا ہے وہ صحیح معنوں میں انسان کہلانے کا مستحق ہوتا ہے۔ بس یہی حال غزل کا ہے غزل کی سرحد ایک طرف ہوا و ہوس سے ملتی ہے اور دوسری طرف حقیقت و معرفت سے اس میں ایک توازن کی ضرورت ہوتی ہے۔ جس میں ذرا بھی فرق آتا ہے تو غزل پھر غزل نہیں رہتی یہ یا تو صوفیانہ شاعری ہو جاتی ہے یا پھر وحشیانہ۔ اس قید و بند کے پیش نظر صنف غزل کی نزاکتوں کا اندازہ ہو جاتا ہے۔

غزل کے اہم عناصر حسن و عشق ہیں۔ پسندیدگی اور ناپسندیدگی کا جذبہ انسان ازل سے اپنے ساتھ لایا ہے۔ پسندیدگی کے جذبہ کا انتہائی درجہ عشق کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اسی جذبہ کی بدولت انسان کو نشاط و انبساط اور رنج و غم سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ عشق اپنے وسیع معنوں میں جو کچھ بھی ہو لیکن غزل میں عشق سے مراد بالعموم مرد اور عورت کے درمیان احساس پسندیدگی ہے۔ اور اس کی وجہ سے جو جذبات موجزن ہوتے ہیں وہ اس کا موضوع ہے۔

عشق کا تعلق دل سے ہے۔ دلی جذبات و قلبی واردات غزل کا موضوع اور ان کو حقیقی طور پر پیش کرنا غزل کا اصل مقصد ہوتا ہے۔ چونکہ عشق زیادہ تر نامرادی و ناکامی کے محور پر ہی گھومتا رہتا ہے۔ اس لئے غزل میں ہجر و فراق یعنی ہمارے احساسات کا بیان ہوتا ہے۔ احساسات کے اظہار کے طریقوں کی کوئی حد نہیں ہوتی اور انہی نے اس تنگ نالے میں سمندر کی سی وسعت پیدا کر دی ہے۔

کوئی دل عشق سے خالی نہیں ہوتا۔ اسی طرح کوئی انسان ایسا نہیں جس کو

اس دنیوی زندگی میں قدم قدم پر ناکامی سے دوچار نہ ہونا پڑا ہو۔ لہٰذا جب کبھی ایسے مغموم سروں کو غزل کے ساز پر چھیڑا جاتا ہے تو سننے والا اپنے دل کے تاروں میں ارتعاش محسوس کرتا ہے۔ یہی ارتعاش اس کے دل میں جذبات کا تلاطم برپا کر دیتا ہے۔ سائنس کا ایک تجربہ صوت وارتعاش بہت عام ہے ایک ہی ساز پر دو برابر کے چڑھے ہوئے تاروں میں سے جب ایک کو حرکت دیتے ہیں اور اگر دوسرا تار اتنا ہی برابر کھینچا ہوا ہوتا ہے تو اس دوسرے تار میں بھی خود بہ خود ارتعاش پیدا ہو جاتا ہے۔ بعینہٖ یہی حال غزل کا ہے اگر فطری زبان میں فطری جذبات پیش کئے جاتے ہیں تو پڑھنے اور سننے والے پر اس کا اثر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔

غزل گو شاعر کی دنیا دل کی دنیا ہوتی ہے۔ یہ اسی دنیا میں چکر لگاتا رہتا ہے۔ یہ دنیا جذبات کے مغموم پیکروں سے آباد ہوتی ہے۔ غزل گو اس مخلوق سے اتنا متاثر رہتا ہے کہ جب اس دنیا سے باہر نکل کر خارجی عالم میں بھی چکر لگاتا ہے تو وہاں کی بھی ہر شئے اسے اسی داخلی رنگ میں رنگی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شفق میں اسے خون عاشق نظر آتا ہے۔ سمندری موجوں میں زنجیر سلاسل دکھائی دیتی ہے۔ رات کی تاریکی میں اپنی سیاہ بختی کا رنگ دیکھتا ہے۔ گل کی شگفتگی سے اسے اپنے دل کی پژمردگی کا احساس ہوتا ہے۔ عشق کی نامرادیوں اور محرومیوں سے گھبرا کر جب اس کا طائر خیال بھٹکتا پھرتا ہے تو دنیا کے مکر و فریب، دنیا کی بے ثباتی اور انسان کی کمزوریوں وغیرہ کا تماشا دیکھتا ہے۔ اس طرح فلسفہ و حکمت اور تصوف بھی شامل ہو جاتے ہیں۔ مگر ان کا ذکر غزل گو اپنے خاص انداز میں کرتا ہے۔

یہ خاص انداز خیال و زبان کی ہم آہنگی سے وجود میں آتا ہے اسی کو غزل کا لب و لہجہ یا رنگ تغزل کہتے ہیں۔ کسی خیال کو بھی جب غزل کے لب و لہجہ میں ادا کیا جاتا ہے تو وہ غزل کے قلمرو میں آجاتا ہے لیکن اگر سلیقہ مندی سے کام نہیں لیا جاتا تو رنگ تغزل پھیکا پڑ جاتا ہے۔ اور شعر تو ہو جاتا ہے۔ مگر غزل کہلانے کا مستحق نہیں ہوتا۔

شاعر نظم گو ہو یا غزل گو اس میں شاعرانہ خلوص کا ہونا نہایت ضروری ہے جس شاعر میں یہ خلوص نہیں ہوتا، اس کا فن نقالی سے زیادہ کچھ نہیں۔ اسی خلوص کو خون جگر اور دل گداختہ کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔ غالب کہتے ہیں:۔

حسن فروغ شمع سخن دور ہے اسدؔ
پہلے دل گداختہ پیدا کرے کوئی

اقبال کہتے ہیں:۔

رنگ ہو یا خشت و سنگ چنگ ہو یا حرف و صوت
معجزۂ فن کی ہے خون جگر سے نمود
آیا کہاں سے نغمۂ نے میں سرور مے
اصل اس کی نے نواز کا دل ہے کہ چوب نے

اصغرؔ نے اس خیال کو اس طرح پیش کیا ہے:۔

جو عرض ہے اسے اشعار کیوں مرے کہیئے
اچھل رہے ہیں جگر پارہ ہائے خون آلود

ولیؔ نے اس خیال کو اس طرح پیش کیا ہے:۔

بے حقیقت گرم جوشی دل میں نہیں کرتی اثر
شمع روشن کیونکے ہووے شعلۂ تصویر سوں

ولی کی اس گرم جوشی کے پیدا ہونے کے اسباب ہم دیکھ چکے ہیں۔ حسن و عشق اس کی دنیا ہے۔ تعمیری عناصر نے اس کے رگ و پے میں عشق کی بجلی بھر دی ہے۔ یہ عشق کو رونق حیات سمجھتا ہے۔ اس کا نقطۂ نظر ملاحظہ کیجیے :۔

شغل بہتر ہے عشق بازی کا
کیا حقیقی و کیا مجازی کا

پاک بازاں سوں یوں ہوا معلوم
عشق مضمون پاک بازی ہے

جو ہوا رازِ عشق سوں آگاہ
وہ زمانے کا فخر رازی ہے

اُن نے پایا ہے منزل مقصود
عشق جس کا ہے ہادی و رہبر

ولی کا عشق تکلفی عشق نہیں ہے ایک صوفی کی حیثیت سے اس نے عشق کی تمام منزلیں طے کی ہیں۔ یہ عشق کی تلخیوں اور دشوار گزار گھاٹیوں سے خوب واقف ہے۔ کہتا ہے :۔

گریہ و گرد ملامت سوں ولی خانۂ عشق کوں تعمیر کیا

اس کوچہ کے تازہ واردوں کو بھی متنبہ کرتا ہے :۔

سفر عشق کا اگر ہے خیال ہمت دل کو زاد راہ کرو

ولی آتے ہیں راہ عشق میں وہ کہ جن کوں استقامت کا عصا ہے
عشق میں صبر و رضا درکار ہے فکر اسباب وفا درکار ہے

عشق نے ولی کے دل کو گداز کر دیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ درد و غم کا بیان پر اثر پایا جاتا ہے۔ اس کے کلام میں سوز و گداز کی مثالیں ملتی ہیں۔ خود اپنے کلام کی حقیقت اس طرح بیان کرتا ہے۔

ولی شعر میرا سراسر ہے درد خط و خال کی بات ہے خال خال

حقیقت میں ولی کے اشعار سراسر درد ہیں اپنے قلبی واردات اور حسن و جمال کے نکات و صفات نہایت سلیس و سادہ زبان میں پیش کرتا ہے اس لئے اس میں تاثیر بھی ہے۔ وہ قدرتی شاعر تھا۔ اس لئے سلاست کے ساتھ اشعار میں جدت تازگی و شگفتگی بھی پائی جاتی ہے۔ سلیس اور سادہ انداز بیان کی وجہ سے ہم اس کے کلام سے سرسری گزر جاتے ہیں۔ لیکن "ہر جا جہاں دیگر ہے" خود ولی کو بھی اس بات کا احساس ہے :-

ولی تو بحر معنی کا ہے غواص ہر ایک مصرع ترا موتی کی لڑ ہے

ولی دیوان میں میرے تو وہ دفتر کی حاجت نہیں
کہ مجھ دیوان میں ہر ایک شعر سو دفتر برابر ہے

ولی کے کلام کا ایک حصہ ایسا بھی ہے۔ جہاں دھوکے کا امکان ہوتا ہے یہ مجاز کے پردے میں حقیقت کے رازہائے سربستہ کی عقدہ کشائی کرتا ہے لہذا ان اشعار کو سمجھنے کے لئے فکر رسا کی ضرورت ہوتی ہے۔ کہتا ہے :-

اے ولی مجھ سخن کو وہ بوجھے جس کو حق نے دیا ہے فکر رسا

ولی کی شاعری اس کے بنیادی تصورات کا ایک حسین امتزاج ہے۔ اسی کو اس نے سحرِ فن کہا ہے :۔

کرتا ہے سحر سدا شعر کے فن میں تجھ نین سوں سیکھا ہے مگر جادوگری کو

اس کی تخلیقات کا مطالعہ ظاہر کرتا ہے کہ اس نے ہر حیثیت سے متضاد عناصر اور تصورات میں ہم آہنگی پیدا کر کے وحدت کا تماشا دکھلایا ہے۔ اس کی تخلیقات کا یہ امتیازی پہلو ہے۔ اس کے کلام میں جہاں لسانی اور ادبی اعتبار سے نئے اور پرانے چراغوں کی دو لَوئیں الگ الگ دکھائی دیتی ہیں۔ وہاں ان میں وحدت بھی پائی جاتی ہے۔ اسی طرح جہاں مجاز اور حقیقت کے دو روپ پائے جاتے ہیں۔ وہاں یہ ایک دوسرے میں سموئے ہوئے بھی نظر آتے ہیں۔

ولی کا تصورِ حسن ہمہ گیر صورت رکھتا ہے۔ یہ حسن کے لئے ذوقِ نظر لایا تھا۔ اور چونکہ وہ صوفی تھا اس لئے اس کو عالم میں ہر طرف حسن ہی حسن نظر آتا ہے۔

یہاں ہے ہر طرف عالم میں حسن بے حجاب اس کا
بغیر از دیدۂ حیراں ہیں جگ میں نقاب اس کا
حسن تھا عالمِ تجرید میں سب سے آزاد
طالبِ عشق ہوا صورتِ انسان میں آ

یہی وجہ ہے کہ ولی ہر صورت انسان میں حسن کا متلاشی اور تماشائی ہے۔ جستجوئے حسن اس کا مقصدِ حیات ہے۔ گویا یہ ایک مہم ہے اور اس مہم کی مختلف نوعتیں ہیں جن کو بغور دیکھنے کے بعد یقین ہو جاتا ہے کہ ولی حُسن اور محض حسن کا قائل تھا۔

ولی کی جستجوئے حسن کی مہم کا بڑا مرکز انسان ہے۔ اس میں بھی عورت مرد، اور چھوٹے بڑے کی کوئی تخصیص نہیں ہے۔ جہاں اور جس ادا میں حُسن نظر آتا ہے اس کا ذوق نظر اس کی ویسی ہی تصویر کھینچ دیتا ہے۔ ولی کو جہاں بعبانِ گجرات و دکن میں شانِ حسن نظر آتی ہے۔ وہاں اپنے احباب سیّد معالی بکیسم چند، گوبند لال، اور محمد یار خان کی خوش روئی میں بھی حسن ازل کے جلوے نظر آتے ہیں۔ اسی طرح جہاں کہیں مرہٹہ لڑکے کا نظارہ اس کی بالیدگی روح کا سامان بنتا ہے وہاں کسی مرزا یا پٹھان کی ادائیں بھی اس کے قتل کے درپئے ہوتی ہیں۔

تیرے نین کی تیغ سوں ظاہر ہے رنگ خون
کسی کوں کیا ہے قتل اے بانکے پٹھان آج

گرچہ سب خوب روہیں خوب ولے — قتل کرتی ہے میرزا کی ادا
عجب معشوق لڑکا مرہٹا ہے — مٹھائی قند شکر سوں مٹھا ہے

حسن کی یہ تمام توصیف و وضاحت ولی کے احساس حسن اور پاک نظری کی غماز ہے۔

پاک بازاں ہیں ہے مشہور ولی — اس سوں چہرے کوں چھپایا نہ کرد
غنیمت بوجھ ملنے کوں ولی کے — نگاہِ پاک بازاں کیمیا ہے

حسن کے نظارہ سے ولی کا مقصدِ خاص دل کی صفائی ہے۔

بس کہ یادِ حسن سیرت بخش ہے — دل مرا صافی میں جیوں درپن ہوا

ولی کے لئے حسن کا دوسرا مرکز فطرت ہے۔ فطرت کے حسین جلووں

کی تاثیر بیان کرنے کے لئے ولی اگر چاہتا تو بیانیہ شاعری کا سہارا لے سکتا تھا۔ اور اس میں بھی کمال فن کا بہترین ثبوت دیتا لیکن چونکہ اس کی فکر کی جولانگاہ صنف غزل ہے اس لئے اس نے غزل ہی کی حدود میں رہ کر داد حسن دی ہے۔ اگرچہ یہ اپنے محبوب کے خدوخال ابھارنے اور اس کے حسن کی فوقیت اور برتری ظاہر کرنے کی غرض سے فطرت کے حسن کو کام میں لیتا ہے۔ لیکن طرز ادا ایسی اختیار کرتا ہے کہ یہ حسن فطرت کی نزاکتوں کا شارح بھی بن جاتا ہے۔

ولی کا حسن ادا بھی اس کے نظریۂ حسن پر روشنی ڈالتا ہے اس کا ذوقِ حسن اتنا رچا ہوا ہے کہ یہ حسن صورت و معنی کے ساتھ حسن ادا کو لازمی قرار دیتا ہے۔ ولی حسن کی نزاکتوں کے ساتھ ساتھ اس کی قوت سے بھی خوب واقف ہے۔ اس کے تصورِ حسن کا اہم نکتہ یہ ہے کہ حسن اس کے دل میں جذبۂ عشق کا محرک ہے۔ آنا ہی نہیں بلکہ محبوب کا خرام ناز اور اس کا اثر، نیز گلشن کی بہار اسی قوت حسن کی وجہ سے قائم ہے۔

ولی کی تخلیقات میں محبوب اس کے تصورِ حسن کی نمائندگی کرتا ہے۔ یہ مجازی اور حقیقی دونوں روپ میں جلوہ گر نظر آتا ہے۔ اس کا ایک رخ ایسا ہے جس کو دیکھ کر اس کے محبوب کو مثالی پیکر کہنا بیجا نہ ہوگا اس پیکر حسن کی تعریف و توصیف میں یہ رطب اللسان پایا جاتا ہے۔ ولی کا حسنِ نظر فطرت کی ہر ادائے حسن پر اس محبوب کے حسن کو فاضل و برتر قرار دیتا ہے اور ایسا کرنے میں اس کے یہاں تکرار و مبالغہ بھی آجاتا ہے۔ تاہم وہ سمجھتا ہے کہ محبوب کی ثنا خوانی کا حق وہ ادا نہیں کر سکتا۔

اے ولی تعریف اس کی کیا کروں ہر طرح مستغنی الاوصاف ہے

اگرچہ اس محبوب کی ہر ادا ولی کے لئے کوثر و تسنیم کا حکم رکھتی ہے لیکن ان میں سے رخ و رخسار، زلف و خط، چشم و ابرو، لب و دہن، قد و قامت، اور خرامِ ناز اس کی آزمائش کے ہمیشہ در پے نظر آتے ہیں۔ ان کا بار بار ذکر، حسنِ فطرت سے اس کا مقابلہ و موازنہ اور مقابلہ میں محبوب کی فوقیت اور فضیلت کو دیکھ کر اس محبوب پر حقیقی ہونے کا یقین کی حد تک گمان ہوتا ہے۔ اور اس کو مجاز سے متمائز کر سکتے ہیں اس کی مثالیں آئندہ ملاحظہ کیجئے۔

ولی کے محبوب کی دوسری تصویر جاندار اور اس عالم و رنگ و بو سے تعلق رکھنے والی نظر آتی ہے۔ ولی کا یہ محبوب اپنے زمانہ کی روایات و تہذیب کا زندہ پیکر ہے۔ اس محبوب میں جسمانی حسن کے جلوے دکھائی دیتے ہیں۔ ولی نے مختلف شکلوں میں حسن کی دلربایانہ ادائیں دیکھی ہوں گی۔ لیکن انہیں اس انداز میں بیان کرتا ہے اور اس طرح ترتیب دیتا ہے کہ اس کا ساجن کوئی خاص فرد معلوم ہوتا ہے اس کے تصورِ حسن کے پیشِ نظر حقیقت میں ساجن تو ایک ہی ہے لیکن اس کے روپ پچاس ہزار ہیں[1]۔ ولی کے اس محبوب کی تصویر اس طرح سامنے آتی ہے۔

موہن ادھر رنگین بدل کھا پان مسی لئے ہیں — لب پر شفق اور شام کوں ایک ٹھار کر دکھلائے ہیں
دسے کاجل سوں تجھ انکھیاں کا یو دھج — کہ برچھی کوں پکڑ نکلا ہے رجپوت
تری یہ زلف ہے شام غریباں — جبیں تیری مجھے صبح وطن ہے

---

[1] محترمہ نعیم النساء بیگم نے اپنے مضمون (نذر ولی ص۱۷) میں لکھا ہے کہ "ولی کا ایک خاص ساجن تھا" وغیرہ اس کا حوالہ دیتے ہوئے ڈاکٹر سید عبداللہ نے اپنے مضمون "جمال دوست، حسن پرست ولی" میں لکھا ہے کہ ولی کے پچاس ہزار ساجن تھے۔

اِس رین اندھیری میں مت بھول پڑوں تس سوں
ٹک پاؤں کے بچھوؤں کی آواز سناتی جا[۲]ے

نہ جانوں کیا بلا لاوے گی اس کے کان سوں لگ کر
بَلائے جانِ مشتاقاں کہ جس کا ناتوں بالی ہے

جامہ زیبوں کو کیوں تجوں کہ مجھے گھیر رکھتا ہے زور دامن کا

اسے دشوار ہے جگ کا نکلنا غم کے پھاندوں سوں
جو کوئی دیکھا ہے تیرے بر میں جامہ دو دامی کا

چیتے کو نہیں دی ہے یہ باریک میانی
پائی ہے کہاں غنچے نے یہ تنگ دھانی

گستاخ ہو کے مہندی تیرے قدم لگی ہے
کس رنگ سوں کہوں میں اس بے ادب کی شوخی

چلنے میں اے چنچل ہاتی کوں لجاوے توں
بیتاب کرے جگ کوں جب ناز سوں آوے توں

نہ جبیں پر کیوں لگائے بیکا
ماہ میں کام کیا ہے دیوے کا

---

[۲] طبع سوم میں بچھوؤں کے بجائے جھانجھر ہے۔ گھنگھرو پاؤں کی انگلیوں میں پہنے جاتے ہیں۔

یہ محبوب ان تمام انداز محبوبانہ جیسے تغافل، بے نیازی، وفا دشمنی، شوخی تقریر، جھجک اور حیا پروری کا بھی حامل ہے۔ ولی موقع محل سے تیشہ و خنجر، تیر و تبر، شمشیر و سناں وغیرہ کی روایتی تشبیہوں سے ان اداؤں کو ابھارتا بھی ہے۔ ولی محبوب کی حیا کا تو اتنا قائل ہے کہ بوالہوس کی نظر کو بھی محبوب کے لئے بار خاطر خیال کرتا ہے۔

وفا دشمن نہ ہو اے آشنا رد — وفا پر ہے مدار آشنائی
مت تغافل کوں راہ دے اے شوخ — جگ ہنسائی نہ کر خدا سوں ڈر
گل ہوئے غرق آب شبنم میں — دیکھ اس صاحب حیا کی ادا

میری طرف ساغر بکف آتا ہے وہ مست حیا
اے دل تکلف بر طرف مستانہ ہو مستانہ

تیری نگاہ خاطر نازک پہ بار ہے — اے بوالہوس نہ پی کی طرف بار بار دیکھ

عشق کے بارے میں ولی کا بھی نظریہ "من بندۂ آزادم عشق است امام من" ہے۔ عشق اس کے لئے اوڑھنا بچھونا ہے۔ یہ اس کا دین و ایمان ہے۔ عشق کو وہ ہادی و رہبر کہتا ہے۔ اور عاشق کو رازی کا درجہ عنایت کرتا ہے۔ عشق کو وہ حیات انسانی کی اہم ترین قدر سمجھتا ہے۔ اس نے شغل سے عشق کو تعبیر کرکے اپنے تصور عشق کا نچوڑ پیش کر دیا ہے۔ کہتا ہے :-

شغل بہتر ہے عشق بازی کا — کیا حقیقی و کیا مجازی کا
پاکبازاں سوں یو ہوا معلوم — عشق مضمون پاکبازی ہے
ان نے پایا ہے منزل مقصود — عشق جس کا ہے ہادی و رہبر

اگرچہ حسن و عشق لازم و ملزوم ہیں مگر ولی عشق کو حسن پر ترجیح دیتا ہے :۔

رکھتا ہے عاشقاں سوں بازارِ حسن گرمی
ہر چیز کی جہاں میں ہے قدر مشتری سوں

جس طرح حسن سے دل کی صفائی ہوتی ہے اسی طرح دل کی تربیت کے لئے وہ عشق کو بہترین آلۂ کار سمجھتا ہے۔ جوہرِ انسانیت اسی عشق سے پیدا ہوتا ہے اور یہی معلّم اخلاق بھی ہے :۔

بسکہ اے نورِ عین تجھ میں ہے انسانیت
عشق سوں تیرے صنم صورت انسان ہوا

وہ عشق کو عقل پر ترجیح دیتا ہے اور اسی لئے سبحہ و زنار سے آزادی کی تلقین کرتا ہے۔ عشق مردِ آزاد کا جوہر ہے۔

شیخ یاں بات تیری پیش نہ جاوے ہرگز
عقل کوں چھوڑ کے مت مجلسِ رنداں میں آ

گر ہوا ہے طالبِ آزادگی بند مت ہو سبحہ و زنار کا

عشق کے متعلق ولی کے اس پاکیزہ تصوّر کو دیکھنے کے بعد اس کے اس مجازی عشق کا تصوّر آسانی سے سمجھ میں آجاتا ہے۔ صوفیا کے ہاں مجازی عشق کا بنیادی اصول یہ ہے کہ جسمانی حسن کی کشش اس کو اکساتی ہے اور اس طرح عشق کا جذبہ متحرک ہوتا ہے جس سے دل کی تہذیب و تربیت کی جاتی ہے۔ ولی کے ہاں مجازی عشق میں یہی تصوّر کارفرما نظر آتا ہے۔ اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ ولی کے عشق کو نفسانی عشق سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے

اس کا مقصد صرف روحانی اتحاد ہے اس کا یہ شعر اس خیال کی تائید کرتا ہے :-

حقیقت کے لغت کا ترجمہ عشق مجازی ہے
وہ پائے شرح میں مطلب نہ بوجھے بو متن ہرگز
یا اس معانی کوں بوالہوس ناداں
کیونکے سمجھے ولی نے کیا پایا

اس کے ذریعہ سے ولی کا سلیقہ محبت اور خلوص عشق واضح ہو جاتا ہے۔ جس طرح محبوب کے دو روپ نظر آتے ہیں اسی طرح یہ عاشق بھی مجازی و حقیقی دونوں روپوں میں ہمارے سامنے آتا ہے۔ اس کردار کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ عاشق عہد شباب کا بڑا قدر داں ہے۔ اور اس کی ولولہ انگیزیوں اور بیباکیوں سے خوب بہرہ ور ہے۔

مت دور ہو یک آن ولی پاس سوں ہرگز — اے باعث جمعیت ایام جوانی
دیکھنے سوں خوباں کے منع مت کر اے زاہد — موسم بزرگی نئیں، عالم جوانی ہے
آشنا نونہال سوں ہونا — ثمرۂ گلشنِ جوانی ہے
تواضع کی توقع نونہالاں سوں نہ رکھ اے ولی
کہ بیباکی و شوخی لازمِ وقتِ جوانی ہے

یہ عاشق اپنے عشق میں اتنا ثابت قدم ہے کہ مجنوں کی روح بھی اس کو استاد گردانتی ہے۔ اس کا والہانہ پن اور جوش و مستی ایک اضطراب مسلسل کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں۔ یہ ہمیشہ دیدار کا منتظر رہتا ہے۔ کیونکہ وہ اس کو اپنی زندگی کے چراغ کے وجود کا باعث سمجھتا ہے اور اس سے اس کی "شبِ قدرِ حیات"

روشن ہوتی ہے۔ اس جنوں و مستی کے باوجود عاشق اپنے آپ کو لئے دیئے رکھتا ہے۔

اے ولی جب سوں کیا عشق میں تحصیل جنوں
روح مجنوں اس کا مجھے استاد کیا

ایک ولی کی طرف نگاہ کرد ۔۔ صبح سوں منتظر ہے درشن کا
کیوں نہ ہووے اے ولی روشن شب قدر حیات
ہے نگاہِ گرمِ گل رویاں چراغ زندگی

آسماں میری نظر میں کلبۂ تاریک ہے
گر نہ دیکھوں تجھ کو اے چشم و چراغ زندگی

قدم پر اس کے رکھتا ہوں سدا سر ۔۔ ولی ہم مشربِ رنگِ حنا ہے
آخر کو رفتہ رفتہ دلِ خاکسار نے ۔۔ تیری گلی میں جا کے کیا ہے مکاں آج

عشق کی اس جوش و مستی میں کبھی کبھی بوس و کنار اور ہم آغوشی کا حرفِ تمنا بھی زبان پر آجاتا ہے:۔

دیکھنے سوں سیر نئیں ہوتا ولی ۔۔ مدعا اس کا کنار و بوس ہے
پیو کے ولی وو دولتِ بوس و کنار کا
اُمید وار مجھ کو کیا روزگار خط

ٹک ولی کو صنم گلے سوں لگا ۔۔ تجھ کوں ہے بندہ پروری کی قسم

لیکن ساتھ ہی ساتھ اس جرأت رندانہ کا اسے احساس بھی ہوتا ہے:۔

اثر بادۂ جوانی ہے ۔۔ کر گیا سوال کچھ کا کچھ

ولی کے کلام میں غم کی جو تشریح ملتی ہے اس کے پیش نظر اس کے فلسفۂ غم کو مسرت و شادمانی کا مترادف کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ وہ غم سے محبت کرتا ہے کیونکہ اس کی اہمیت اور اس کے صحیح فعل و عمل سے خوب واقف ہے۔ اس کی نظر میں صرف عشق کی پرچھائیں نہیں ہے۔ بلکہ یہ عشق کی شدت و صداقت کا پیمانہ بھی ہے۔

آب سوں دریا کے ہرگز کام نئیں عشاق کوں
گریۂ حسرت سوں ہے سرسبز باغ عاشقی

گریہ و گرد ملامت سوں ولی — خانۂ عشق کوں تعمیر کیا
ولی اس واسطے گریاں ہوں ہر آن — کہ تر ہو سبزہ زار آشنائی
کیا کہوں نبضِ دل کی بیتابی — قوت جس کا ہے آتش و نشتر
اشکِ خونین سے جو کیا ہے وضو — مذہبِ عشق میں نمازی ہے

اس تشریح غم کو دیکھنے کے بعد جب عاشق کی طرف رجوع کرتے ہیں تو وہ سراپا درد پایا جاتا ہے۔ ہجر و فراق کے صدمے اور محبوب کے جور و ستم سہنے کے لئے دل لایا ہے۔ ہجوم یاس اس کے گرد و پیش منڈلاتا رہتا ہے مگر گھبرانے کی بجائے عاشق ان سے محبت کرتا ہوا پایا جاتا ہے۔

تجھ ہجر میں داماں و گریباں و رومالاں
شاکی ہیں ہر اک رات مرے دیدۂ ترسوں

تجھ جدائی میں نئیں اکیلا میں — درد و غم آس پاس ہوتے ہیں
رکھ قدم مجھ دیدۂ خونبار میں — گر تجھے رنگِ حنا درکار ہے

شبِ فرقت میں مونس و ہمدم — بے قراری و آہ و زاری ہے
بے کسی کے حال میں یک آن میں تنہا نہیں — غم ترا سینے میں میرے ہمدم جانی ہوا

اس جگہ ولی کے فلسفۂ غم سے متعلق ایک نکتہ قابلِ غور ہے۔ ولی کے غم میں بلا کا سوز ہے۔ تاہم اس کے مطالعہ سے احساسِ شکست و نامرادی نہیں پایا جاتا بلکہ دردمندی کے ساتھ احساسِ شگفتگی ملتا ہے اس کے ہاں نہ تو کہیں نجاتِ غم کی خواہش کا اظہار ہے اور نہ کہیں دعا کو ہاتھ اٹھتے ہیں اور نہ مرگ و جنازہ اور گور و کفن کا تصور ملتا ہے۔ اگر کہیں ان کا استعمال ملتا بھی ہے تو کمالِ فن کے سلسلہ میں ملتا ہے جیسے[1] اس نشاط انگیزی کا بڑا سبب اس کا یہ نقطۂ نظر ہے۔

کیا غم ہے اسے تیرِ حوادث سوں جہاں میں
بوجھا کوئی گردش ساغر کوں سپر کر

خاکساری جس کو سلطانی ہے اس عالم مینں
کاسۂ خاکی اسے جیوں چینیٔ فغفور ہے

جب لگ ہے آسمان و زمین جگ میں برقرار
جیوں پھول اس جہاں کے چمن میں ہنسا کرو

ولی کے حالِ غمِ دوراں اور غمِ جاناں کی آمیزش کچھ اس طرح ملتی ہے کہ ایک کو دوسرے سے الگ کر کے دیکھنا ممکن نہیں ہے۔ ولی کا یہی رجحان میر نے ترقی دے کر اپنا لیا ہے۔ ولی کے اس مسرتِ غم کی وجہ سے بعض محققین کو دھوکا ہوا

---

[1] جو شائق شمع رو کا ہے اسے وسواس جاں سوں کیا
نہ دھرنا مثل پروانے کے پروا کیے کفن ہرگز
ولی جو جی دیا اس خط کو کر یاد ::: بجا ہے گر کریں اس کا کفن سبز

ہے اور یہ سمجھا جاتا ہے کہ ولی کے کلام میں غم کے عناصر بمنزلۂ صفر ہیں۔ اور اس کے مضامین میں ہجر و فراق کی سچائی نہیں ہے[1] مگر حقیقت یہ ہے کہ اس کے زاویۂ نظر کی خصوصیت نے اظہارِ غم میں تیزابی کیفیت پیدا نہ ہونے دی۔ اس کے کلام میں بعض اشعار کے پیش نظر یہ خیال ہوتا ہے کہ اگر ولی صرف غم دوراں کی تشریح و تفسیر کی طرف توجہ کرتا تو شاید اُردو ادب میں یقیناً سب سے بڑا مصورِ غم اور شارح سمجھا جاتا۔ وہ جہاں کہیں حسن و عشق سے ذرا الگ ہو کر فلسفیانہ انداز میں مادی رنج و غم کی طرف اشارہ کرتا ہے وہاں چبھن کے احساس سے دل چیخ اٹھتا ہے۔ دو ایک شعر ملاحظہ فرمائیے :-

اس کوں حاصل کیونکہ ہوئے جگ میں فراغ زندگی
گردشِ افلاک ہے جس کوں ایاغ زندگی

جمعیت آسماں سوں! توقع بجا نہیں
ہیں آفتاب و ماہ ہمیشہ سفر منیں

اس عاشق کی وفاشعاری اس کے کردار کی ایک نمایاں خصوصیت ہے۔ اس کا محبوب ہر چند تغافل شعار ہے۔ مگر یہ بندۂ وفا اپنے لئے کہتا ہے :-

وفا کوں ترک مت کر ہرگز اے دل — محبت ہے وفا بن سست بنیاد

اسی طرح عاشق کو اپنے محبوب کا پاس خاطر زیادہ عزیز ہے ؎

عشق اس کا ہے ناتمام جسے — پی کی خاطر کا اہتمام نہیں

یہی وجہ ہے کہ اپنے محبوب کو رقیبوں سے دور رہنے یا وفاشعاری

---

[1] ڈاکٹر سید عبداللہ، مضمون "جمال دوست حسن پرست ولی" برگ گل بابت۔

کی تلقین کرتا ہے۔ یا جب اپنی طرف مائل کرنا چاہتا ہے تو نہایت سنجیدگی اور عاجزی سے کہتا ہے :-

وفا دشمن نہ ہو اے آشنا رو — وفا پر ہے مدار آشنائی
رحم بے جا، ستم برابر ہے — تو رقیباں اُپر کرم مت کر
مت مار دلی کوں میرا اتنا تو کہا کر — یو ناز جگ میں اٹھا کون سکیگا

کبھی کبھی لطیف طنز سے بھی کام لیتا ہے۔ اس سے بھی عاشق کی متانت ظاہر ہوتی ہے :-

حق پرستی کا اگر دعویٰ ہے — بے گناہوں کو ستایا نہ کرو
حاکم وقت ہے تجھ گھر میں رقیب بدخو — دیو مختار ہوا ملک سلیماں میں آ

دلی تواضع سوں رقیبِ سنگدل دائم پشیماں ہے
خجل ہے منفعل ہے سخت رسوا ہے

لیکن اسے اپنے محبوب پر اتنا اعتماد ہے کہ اس کی تغافل شعاری کے لئے بعض اوقات رقیب ہی کو ذمہ دار ٹھہرانا ہے :-

نہ بوجھو خود بخود موہن میں اڑ ہے — رقیبِ روسیہ فتنہ کی جڑ ہے

آخر میں عاشق کی نفسیات کی دو چار مثالیں دیکھیے :-

ڈرتا ہوں سادگی سوں موہن کی آ دلی — اس خوف سوں رقیب کی غیبت نہیں لکھی
دیتا نہیں ہے بار رقیب شریر کوں — شاید کہ بوجھتا ہے ہمارے ضمیر کوں
مجلس شوخ میں مجھے کچھ بھی — صحبت وصل کوں جواب نہ تھا

---

۱ و ۲ ان اشعار میں رقیب غور طلب ہے صوفیا کی اصطلاح میں خیال بد یا رکاوٹ کے معنی ہوتے ہیں

بات کہنے کا کبھی جو وقت پاتا ہے ولی
بھول جاتا ہے وو سب کچھ دیکھ صورت یار کی

داستان محبت کے اس کردار کو جس طرح زمینوں کی پنہائیوں میں اپنے محبوب حقیقی کے پیچھے سرگرداں دیکھا جاتا ہے، اسی طرح یہ آسمانوں کی بلندیوں میں بھی محبوب کے جلوؤں میں کھویا ہوا پایا جاتا ہے۔ ان موقعوں پر مجاز و حقیقت میں امتیاز کرنے کے لئے صرف ذوق و نظر ہی رہبری کر سکتے ہیں۔

عجب نئیں دام میں اس کے اگر اٹکا ولی کا دل
کہ اس کے دام میں لاکھاں پھنسے ہیں اہلِ دل آکر

ہر ذرّۂ عالم میں ہے خورشید حقیقی
یوں بوجھ کے بلبل ہوں ہر یک غنچہ دہن کا

اُس وقت مجھ کوں عیش دو عالم ملے ولی
جس وقت بے حجاب کروں پیو سنگات بات

معشوق ہے بغل میں ولی یہ سنتا ہوں میں
مت دل کے باج اس کوں کہیں جستجو کرو

عاشقاں کی قید تیرا حسن عالم گیر ہے
بلبلاں کوں بند کرنے موج گل زنجیر ہے

آرزو ہے بت ولی کوں وصل کی
کب ملے گا میرے تئیں وو نورِ خاص

خوشہ چیں جمال جاناں ہیں خرمنِ ماہ و خوشۂ پروین

نقد دل دو جے کوں دینا تجھ بغیر
حق شناساں کے نزک اسراف ہے

ترے جلوے سوں ہے گل تازہ وتر
چمن میں بلبلاں کا ہر طرف جوش

اس تمام روئداد حسن وعشق میں لہجہ کی متانت اور آواز کا دھیما پن ایک عظیم شخصیت کے فکر ونظر کے غماز ہیں غرض ولی نے غزل کے ڈھانچے میں جو داستان محبت پیش کی ہے اس میں اس کے تصورات حسن وعشق پوری طرح کارفرما ہیں۔ اس نے عشق کیا اور اپنے تجربہ کے متعلق یہ بھی کہدیا کہ

اے ولی طرز عشق آساں نئیں آزمایا ہوں میں کہ مشکل ہے

تصورات کے علاوہ ولی کا گہرا شعور زندگی اور ذوق فن وجمال بھی اس کی شاعری میں اس طرح گھل مل گئے ہیں کہ ایک طرف ولی کے مجازی پہلو کہ عینیت وحقیقت کے پیش نظر یہ روایتی ورومانی حکایت معلوم ہوتی ہے۔ اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس مادی دنیا میں ولی پر کوئی سانحہ ضرور پڑا ہے۔ دوسری طرف حسن کی دلفریبیاں، شباب کی سرمستیاں اور بے باکیاں، ہجر وفراق کے لمحے، ناکامیوں کے صدمے، عاشق کی سعی پیہم، حوصلہ مندی، عجز وانکسار، استقامت وفاداری، محبوب کی بے نیازی وحیا پروری، مسائل حیات انسانی کے بھی غماز نظر آتے ہیں۔ اور ماورائی نقطۂ نظر سے یہ داستان عشق کسی صوفی کے دل صد چاک کی روئداد بھی معلوم ہوتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ داستان بیک وقت مجازی، حقیقی اور فلسفۂ حیات کے پہلوؤں کو اپنائے ہوئے ہے۔

یہ اس کا کمال فن ہے۔ اس نے ایک ہی نقش میں کئی نقوش کو یکجا کر دیا ہے اور کئی رنگوں کی آمیزش سے اس نقش میں وحدت پیدا کی ہے۔ یہی اس کے فکر کا رمزی پہلو ہے اور اس لئے یہ بآواز بلند کہتا ہے :-

سخن شناس کے نزدیک نئیں ہے کم زیبد
کسی کے مطلب رنگیں کوں جو کیا۔ ہے شہید

جلوہ پیرا ہو شاہد معنی جب زباں سوں اُٹھے نقاب سخن
اے ولی مجھ سخن کو وہ بوجھے جس کو حق نے دیا ہے فکر رسا
گرچہ پابند لفظ ہوں لیکن دل مرا عاشق معانی ہے

تخیل شاعری کا اہم عنصر ہے۔ جہاں تک غزل کا تعلق ہے۔ تخیل، جذبات کی تشریح کا بہترین آلہ ہے جب عاشق (شاعر) کے دل میں جذبات کا طوفان اُٹھتا ہے اور یہ انہیں دنیا کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہے تو دل کی دنیا سے نکل کر خارجی عالم میں جذبات کی تشریح کے لئے موزوں و مناسب ذریعے تلاش کرتا ہے اس دوران میں اس کے طائر خیال کی پرواز بہت بلند ہوتی ہے خارجی عالم میں عاشق ہر شئے کی خوب جانچ پڑتال کرتا ہے۔ ایک ایک سرے کو مختلف زاویوں سے دیکھتا ہے۔ چونکہ جذبات لطیف ہوتے ہیں اور ان میں سے بعض لفظ و صوت کے متحمل بھی نہیں ہو سکتے۔ عاشق ایسے جذبات کو تشبیہ و استعارہ اور رمز و کنایہ کے پردے میں پیش کرتا ہے۔ عاشق اس طلسم خانہ کا خالق ہوتا ہے یہاں اپنی قوت متخیلہ سے بے جان اشیاء کو جاندار بنا دیتا ہے۔ غیر مرئی چیزیں مرئی نظر آنے لگتی ہیں۔ اس عالم میں عاشق کا منطقی استدلال بھی بالکل مختلف ہوتا ہے۔

ایسے مقامات پر پیچیدہ اظہارِ خیال کا ہر قدم پر اندیشہ ہوتا ہے۔ مگر سلیقہ مند شاعر اپنے طرزِ ادا کی خوبی سے پیچیدگی پیدا ہونے نہیں دیتا نہ واقعیت سے دور جا پڑتا ہے۔

دیکھا گیا ہے کہ بعض اوقات شاعر کی پروازِ تخیل اسے بہت بلند مقام پر پہنچا دیتی ہے۔ اور خیالات کا خزانہ اس کے ہاتھ لگ جاتا ہے مگر جب ان خیالات یا ان کے ذریعے جذبات کو ہم تک پہنچانا چاہتا ہے تو اسے کامیابی نہیں ہوتی۔ اس کا بڑا سبب تشبیہ و استعارہ اور انتخاب الفاظ و تراکیب کی پیچیدگی ہوتا ہے۔ جو ہمارے اور شاعر کے درمیان سدِ راہ بن جاتا ہے۔ یہ صرف ماہر فن ہی کے بس کی بات ہوتی ہے جو ایسے موقعوں پر خیالات کو بہ آسانی ہم تک پہنچا دیتا ہے۔

ولی کا شاہینِ خیال جب عالمِ تخیل میں پَر تولتا ہے تو اپنی جھپٹ میں لیاقت کے شایانِ شان مضامین لاتا ہے۔ ولی جانی پہچانی تشبیہوں اور استعاروں کو بھی کام میں لاتا ہے۔ مگر وہ اپنے شاعرانہ کمال کی بدولت ان کو کہنگی و فرسودگی کے الزام سے بری کر دیتا ہے۔ مگر ساتھ ساتھ لطیف و نادر تشبیہوں اور استعاروں کو بھی سمیٹتا ہوا جاتا ہے۔ اس طرح ولی کے چمن زارِ سخن میں قسم قسم کے گل بوٹے پائے جاتے ہیں۔

نہیں شفق ہر شام تیرے خواب کوں پنجۂ خورشید مخمل باف ہے
بندھا ہے اے صنم جو دل ترے ماتھے کے صندل پر
عجب نئیں ہے اگر سایہ سوں اس کے برہمن کالے

اعجاز حسن دیکھ کر وہ روئے باعرق
پیدا کیا ہے چشمۂ آتش سوں آب آج

یوں دوستاں کے ہجر میں داغاں ہیں سینے پر ولی
صحرا کے دامن کے اُپر جیون نقشِ پائے رہرواں

دل کو جمعیت ہے جب جاتا ہے دنبال صنم
آرسی کے ساتھ میں سیماب کوں کب آرام ہے

مسندِ گل منزل شبنم ہوئی دیکھ رتبہ دیدۂ بیدار کا
آسماں اوپر نہ لوجھو چادر ابرِ سفید جانماز زاہدِ عزلت نشین برباد ہے

گریۂ عشاق سوں خنداں ہے باغِ بزمِ حسن
مغزِ پروانہ سوں روشن ہے چراغِ بزمِ حسن

تشنگی اپنی نہیں کہتا کسی بے آب کوں
جیوں گھیر رکھتا ہے دائم جوگرہ میں آب کوں

خوبی سوں تجھ حضور شمع دم زنی میں ہے
اس بے حیا کی چرب زبانی کو دیکھ توں

معشوق کو ضرر نہیں عاشق کی آہ سوں
بجھتا نہیں ہے بادِ صبا سوں چراغِ گُل

ہے حسن ترا ہمیشہ یکساں
جنت سے بہار کیونکے جاوے

ولی اکثر اوقات علمی ادبی اور فنی اصطلاحات کو استعارۃً استعمال کرتا

ہے۔ شعرائے متاخرین فارسی میں غنی کاشمیری، بیدل، صائب وغیرہ کی بھی یہ ایک نمایاں خصوصیت ہے۔ اس سے ولی کی علمی لیاقت کا اندازہ ہوتا ہے۔

یو خط کا حاشیہ گرچہ ولی ہے مختصر
مطول کے معانی کا تمامی مدعا دستا

حکمت بوعلی سوں نہ پوچھ — نیئں وہ قانون شناس اس فن کا
لکھا تجھ دہن کی صفت میں ولی — ہر ایک فرد میں جوہر فرد کوں
کاف کوئی ہے تجھ کمر کا پیچ — جگ میں اس کو سر کلام کیا

تیرے لبِ یاقوت اُپر خطِ خفی دیکھ
خطاط جہاں نسخ کئے خطِ جلی کوں

ہے رنگ آسمان پہ ملک جب کیا شکار
آہو نے تجھ نین کے فلک کے اسد نیئں

الفاظ بظاہر بے جان معلوم ہوتے ہیں مگر ان کا صحیح اور برمحل استعمال انہیں جاندار بنا دیتا ہے۔ اور ان میں پوشیدہ قوتوں کو اجاگر کر دیتا ہے۔ ولی سے پہلے فارسی الفاظ، محاورات، تراکیب وغیرہ کا ایک بڑا ذخیرہ اُردو میں منتقل ہو چکا تھا۔ اگرچہ شعراء انہیں اپنی تخلیقات میں جگہ دے چکے تھے، لیکن ان میں سے زیادہ الفاظ ابھی اپنے معنی و مفہوم کے اعتبار سے ہندی ماحول میں جگہ نہ پا سکے تھے اور نہ زبان کی خراد پر چڑھ سکے تھے۔ اسی لئے اس وقت کی زبان میں ایسے فارسی الفاظ بے جوڑ اور بھدّے نظر آتے ہیں۔ غرض وہ ہم آہنگی پیدا نہیں ہوئی تھی جس سے زبان میں حسن پیدا ہوا کرتا ہے۔ اس وقت

کی زبان کی مثال آج بھی ان لوگوں کی گفتگو میں مل جاتی ہے جو عربی یا فارسی ہندی یا انگریزی کے الفاظ کا بے جوڑ استعمال کر جاتے ہیں۔

ولی زبان کا بڑا نبض شناس تھا۔ اس نے اپنے زمانے کی زبان کے اس نقص کو پالیا تھا۔ اور یہ بھی معلوم کر لیا تھا کہ موجودہ زبان اس کے خیال کی رفعت اور اس کے ذوق کی لطافت کا کسی طرح ساتھ نہیں دے سکتی تھی۔ اس کمی کو پورا کرنے کے لئے اس نے اپنے ذوق و اجتہاد سے کام لیا۔ ولی لفظ و صوت کی ہم آہنگی اور ان کی قوت اور زور سے واقف تھا اور ان میں جو معنی و مفہوم پوشیدہ ہیں ان کا بھی راز دار تھا۔ لہٰذا اس نے الفاظ کے صحیح اور برمحل استعمال اور ان کے حسن ترتیب سے صرف زبان ہی کو توانائی نہیں بخشی بلکہ اپنے اسلوب بیان کو بھی حسن عطا کیا۔ چونکہ وہ شاعر تھا اس لئے اس تمام عمل میں میکانیت نہیں ہے۔ اس کے ذوق و وجدان اور زور تخیل اس خوش اسلوبی کے ذمہ دار ہیں۔ خود ولی کو اپنی زباندانی اور معنی آفرینی کا بخوبی احساس تھا، کہتا ہے :-

ولی رکھتا ہوں سینہ میں ہزاروں گوہر معنی
دکھاؤں اپنے جوہر کوں اگر کوئی جوہری آوے

ولی تو بحر معنی کا ہے غوّاص
ہر ایک مصرع ترا موتی کی لڑ ہے

الفاظ کے علاوہ ولی نے فارسی محاوروں اور ترکیبوں کو بھی اس خوش اسلوبی سے اردو میں استعمال کیا ہے کہ اس کے طرز ادا میں حسن و خوبی

پیدا ہوگئی ہے۔

(۱)۔ فارسی لغات اور محاوروں کے ترجمہ پر مفصل مضمون اس کتاب میں شامل ہے اس لئے یہاں چند مثالوں پر اکتفا کیا جاتا ہے:۔

تیغ افشاندن ۔ تیغ جھاڑنا۔

تیغ ابرو کی جب وہ جھاڑا ہے۔

طرز کسے گرفتن ۔ طرز لینا۔

کیوں نہ لیوں زاہداں تجھ دیکھ طرز برہمن۔

گوشہ گرفتن = گوشہ پکڑنا۔ جس نے پکڑا گوشۂ آزادگی۔

آہنگ چیزے داشتن = آہنگ رکھنا۔

اے بوالہوس نہ دل میں رکھ آہنگ عاشقی

ارزانی باد = ارزانی ہونا۔

کام گرفتن = کام پانا۔

راز طشت از بام شدن = راز پڑا بام پر سوں طشت طشت از بام ہونا

مجھ راز دل کا آج پڑا بام پر سوں طشت

ہراس گرفتن = ہراس پکڑنا۔

(۲)۔ ولی کے کلام میں فارسی کی دلکش اور خوبصورت ترکیبیں بھی ملتی ہیں مشتے نمونہ از خروارے دیکھئے:۔

گل داغ الم، خزاں خاطر عاشق، گوہر کان حیا، باعث جمعیت ایام جوانی

مینائے شراب، بزم حسن، تشنۂ سبز خط خوباں، یوسف کنعان دل، سامان طغرائے نیاز، مُہر فرمان وفاداری، شمع بزم اہل معنی، رشک ہزاراں گل، مجنوں لیلیٰ حسن، داغ بخش سینہ و دل، مطرب نغمہ ساز، مورد انوار آگہی، بہار گلشن خوبی، گوہر بحر نکتہ دانی، گل بہار دل، مصرع زنجیر جنوں، لذت دشنام، بہار کرم، حیرت آب، مطرب نغمہ ساز، محفل عشق، مورد انوار آگہی، بہار گلشن خوبی، گوہر بحر نکتہ دانی، گل بہار دل، خضر رنگ، خم نیلی، گرم نگاہی، صحیفۂ سیما، پردۂ مینا، موج بیتابیٔ دل، سبزہ زار، خموشی جنت احباب تمنا، نرگستان حیا، صفحۂ سینا موج آب یاقوت، موج آب وفا، حصار خاموشی، سنبل خیز، بہار نیم خوابی، پنجۂ خورشید، عقیق جگری، آتشیں نشتر۔

ان میں سے چند کا محل استعمال بھی ملاحظہ فرمائیے :۔

چمن میں جلوہ گر جب وہ گل رنگیں ادا ہووے
خزاں خاطر عاشق بہار مدعا ہووے

مثل مینائے شراب بزم حسن
حوض دل مجھ عکس سوں روشن ہوا

تشنۂ سبزیٔ خط خوباں — والی عالم خیال ہوا
صنم کے لعل پر وقت تکلم — رگ یاقوت ہے موج تبسم

اشک خوں آلود ہے سامان طغرائے نیاز
مُہر فرمان وفاداری ہے داغ عاشقی

وتی اس گوہر کانِ حیا کی کیا کہوں خوبی
مرے گھر اس طرح آتا ہے جیوں سینے میں راز آوے

اے عزیزاں سیر گلشن ہے گلِ داغ الم
صحبت احباب ہے معنی میں باغ زندگی

مطربِ نغمہ سازِ محفلِ عشق — تان گاتا نہیں ہزار افسوس
تجھ بِن اے داغ بخش سینہ و دل — چمن لالہ دشتِ آتش ہے

جب سوں ترے مکھ کی یاد کرتا ہوں اے گلبدن
تب سوں ہر اک زخم دل باب گلستان ہوا

لولیٔ فلک مکھ میں انگشت تحیر کے
جب پاؤں نزاکت سوں مجلس میں نچا دے توں

اگر چمن میں نہیں باس مرے پیتم کی
تو میرے دل کوں ز گل گشت لالہ زار چہ حظ

خط کے آنے نے خبردار کیا گل رو کوں
تشنۂ ہوش ہے اس بادہ ریحانی میں

تجھ زلف کا خیال کہ وہ رشک مشک ہے
غیر سوں موج بحر میں جا ہم نشین ہوا

تیری نین پہ دیکھ میں آہو کے مبتلا
بوجھا کہ تجھ نگہ میں ہے وحشت شعار بند

تیری کمر مصوّر چترا ہے اس اداسوں — کہتا ہے صرف اس میں ناز و نیاز گویا

سجن کا مکھ منوّر، نُور آیت، فال مصحف ہے
کہ اہلِ نامراداں پر دُعائے ھل اتیٰ حافظ

ولی کو علم معانی و بیان سے دلی لگاؤ تھا۔ اس نے فارسی کی تمام صنعتوں کو کام میں لاکر اپنی استادانہ لیاقت، کا ثبوت دیا ہے۔ مگر صنعت ایہام کے استعمال میں اس نے قدرت زبان کے ساتھ سلیقہ مندی کا بھی ثبوت پیش کیا ہے۔ ولی کے کلام میں یہ امتیازی خصوصیت ہے۔ شمالی ہند میں ولی کے کلام کی اس خصوصیت سے بھی شعرا بہت متاثر ہوئے، بلکہ بعض ریختہ گویوں نے اسی پر اپنی شاعری کا مدار رکھا تھا لیکن ان میں ولی کی سی سلیقہ مندی نہ ہونے کی وجہ سے یہی خصوصیت ان لوگوں کے کلام کا عیب بن گئی۔

ایہام گوئی ہندی شاعری کی مقبول ترین خصوصیت ہے۔ اسی طرح فارسی شعرا متاخرین کے ہاں صنعت حسن تعلیل امتیازی طور پر پائی جاتی ہے ولی نے ہندی سے ضرور اثر لیا ہوگا مگر ولی کے ہاں یہ خصوصیت فارسی ہی کا اثر معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ ایہام گوئی سلاطین دکن کے کلام میں بھی مفقود ہے جن کا طرز تخیل ایک حد تک ہندی تھا۔ ولی نے تصوّف کے زیر اثر بھی اس صنعت کی طرف رجوع کیا ہوگا۔ کیونکہ تصوف میں ذو معنین سے بھی بڑا فائدہ اٹھایا جاتا ہے۔ ولی نے رعایت لفظی کو بھی اسی طرح خوش اسلوبی سے برتا ہے۔ لکھتا ہے :-

ولی ارباب معنی میں اسے ہے عرش کا مرتبہ
مری زاد معانی کوں جو کُرسی پہ بٹھلاوے

یہ دیکھنے کے لئے کہ ولی نے اس پریزاد کے حسن کو اپنی خداداد صلاحیتوں سے کس طرح سنوارا نکھارا ہے۔ اس کے چند اشعار ملاحظہ ہوں :-

دو چشم چار ہوئی شوق کے دو ابرو سیں
رسے نہیں دو دو رنگی ہوا دو چار ہنوز

تجھ زلف نے جو دائرے باندھے صفا رخسار پر
دیکھتے نہیں اس شان کا کوئی صاحب
آسماں اُپر نہ بوجھو چادر ابر سفید

جا نماز زاہد عزلت نشیں برباد ہے
نہ جا انکھیاں میں آ مجھ دل میں اے شوخ
کہ نئیں خلوت میں دل کی خوف مردم

تجھ پھولوں کو جب سوں دیکھا تجھ پاس اے سرچن
گوشے میں بیٹھ چلہ مثل کماں ہوا خم
تجھ حسن کی جھلکار سوں کیا بدر کوں نسبت
جو کُئی کہ تجھے بد کہے اس کوں بد ر کر

تشبیہ جو تجھ خط کوں دیا مشک ختن سوں
عالم کوں دو آگاہ کیا اپنی خطا پر

غزل کی ہئیت میں رمز و کنایہ، ایما و اشارہ کو جو اہمیت حاصل ہے وہی اہمیت ولی کے حسن ادا میں حاصل ہے ولی کو چونکہ حسن و عشق سے واسطہ تھا۔ اس لئے اس نے جذبوں کی تہوں اور حسن کی باریکیوں تک اسی کے ذریعہ

سے ہمارے ذہنوں تک پہنچایا ہے۔ اسی طرح اس نے علامتوں اور تلمیحوں سے بھی حسن پیدا کیا ہے۔ اور لطف یہ ہے کہ کہیں بھی پیچیدگی پیدا نہیں ہونے دی ہے۔ اسی ایمائیت و اشاریت کی وجہ سے اس کے کلام کا ایک حصّہ ایسا پایا جاتا ہے جو مجاز اور حقیقت دونوں کا حامل معلوم ہوتا ہے۔ ولی کو بھی اس خصوصیت کا احساس تھا۔ اس نے کئی جگہ اس کا اظہار کیا ہے۔

ولی دیوان میں میرے تو وہ دفتر کی حاجت نئیں
کہ مجھ دیوان میں ہر ایک شعر سو دفتر برابر ہے

یوں تجھ سخن میں نشۂ معنی ہے اے ولی
جیوں رنگ و بوئے مئے سے لبریز ایاغ گل

قافیہ ردیف اور بحر بھی ولی کے فنی و جمالیاتی احساس اور ذوق و سلیقہ کے غماز ہیں، یہ ان کی قوت و عمل سے خوب واقف تھا۔ اس نے اپنے کلام میں موسیقیت پیدا کرنے اور بعض جگہ رمزی کیفیتوں کو ابھارنے کے لئے انہیں سے کام لیا ہے اور غزل کے آہنگ میں توازن قائم کیا ہے۔ اس کا کمال صرف شیریں و مترنم قافیوں اور ردیفوں ہی میں پوشیدہ نہیں ہے بلکہ بعض جگہ ایسے سخت قافیے استعمال کئے ہیں کہ اگر انکو غزل سے الگ کر دیا جائے تو کرختگی ظاہر ہوگی مگر ولی نے اپنے حسن ذوق سے ایسے قافیوں سے بھی ترنم کا کام لیا ہے۔ بحروں کے انتخاب میں بھی اس کے ذوق کی داد دئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ خصوصاً چھوٹی بحروں میں تو اس کی خوش بیانی، ذوق و وجدان کے لئے آب حیات ہے۔ ان کی غنائیت ہمارے دل کے اندر دلی احساسات کو بیدار کر دیتی ہے۔

ولی کی صوفیانہ شاعری

تصوف اسلامی تمدن کی ذہنی و فکری کاوشوں کی تخلیق ہے۔ عربی، فارسی اور اردو میں اس کے بیش بہا خزانے محفوظ ہیں۔ جب اہل اللہ نے معرفت الٰہی کے رازہائے سربستہ کی عقدہ کشائی اور عشق الٰہی میں اپنے دلی کوائف کے اظہار کے لئے شاعری کو اپنایا تو تصوف کے اعجاز نے اسے بھی کندن بنا دیا۔ فارسی اور اردو شاعری میں صوفیانہ شاعری انھیں کے افکار کی برکتوں کا نتیجہ ہے۔ تصوف کے بنیادی تصورات شاعری کے لئے بہت مناسب ثابت ہوئے اور یہ دونوں ایسے گھل مل گئے کہ ایک دوسرے کی بقاء کے ذمہ دار ٹھہرے۔ اتفاق سے تصوف و شاعری کا اتحاد بھی ایسے زمانہ میں ظہور پذیر ہوا جو ان دونوں کے فلاح و بہبود کے لئے مبارک ثابت ہوا۔ صوفیانہ شاعری کی تاریخ بیان کرتے ہوئے مولانا شبلی نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ فارسی میں تیسری صدی ہجری سے شاعری کے آغاز کا پتہ چلتا ہے۔ لیکن پانچویں صدی ہجری میں جب ایران کو تاتاریوں نے تاراج کیا تو اس محشر خیز واقعہ نے اہل ایران کے قلب و نظر اور ذہن و فکر میں بھی ایک محشر بپا کر دیا اور عالم بے بنیاد کی حقیقت اور خدائے قہار کی مصلحت کو دیکھ کر یہ لوگ تصوف کے

درس فنا اور تسلیم و رضا کی طرف متوجہ ہو گئے۔ فلسفیانہ موشگافیاں بھی آلام و مصائب کے دور میں ان کے لئے طفل تسلیوں کا باعث ہوئیں۔ اس طرح تصوّف جو فلسفہ و اخلاق کا مجموعہ ہے عام ہوتا گیا۔ خوش قسمتی سے زمانے نے ایسے صوفی شاعر بھی پیدا کر دیئے جنھوں نے تصوّف کو شاعری میں تحلیل کر دیا۔ غرض اہل ایران کی قوّت متخیلہ نے اس میدان میں ایسا رنگ جمایا کہ سیکڑوں صوفیانہ، فلسفیانہ اخلاقی مثنویاں وجود میں آئیں۔

صوفیانہ شاعری کے لئے اصناف سخن میں سے غزل اور مثنوی کے میدان کار آمد ثابت ہوئے۔ ان میں بھی تصوّف کو غزل کی ہوا زیادہ راس آئی۔ یہ کہنا نامناسب نہ ہوگا کہ غزل کے ذریعے تصوّف کو زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی غزل اور تصوف میں باعتبار خیال بڑی مماثلت ہے۔ دونوں کے ضمیر کا جزو اعظم حسن و عشق ہے۔ دونوں کے قصر جذبات کی بنیاد پر تعمیر ہوئے ہیں۔ ان کی نوعیت میں یہ فرق ہے کہ ایک کا تعلق خدائے کارساز سے ہے اور دوسرے کا تعلق کرشمۂ کارساز سے ہے۔ ایک کا مقصود حسن ازل ہے اور دوسرے کا پرتو حسن ازل۔ ایک کی منزل قریب اور دوسرے کی منزل دور ہے، لیکن حقیقت کے جویا بھی اپنا سفر مجاز ہی سے شروع کرتے ہیں۔ غزل میں تصوف کے گھل مل جانیکا دوسرا اہم سبب رمز و کنایہ ہے۔ اس کا تیسرا سبب یہ ہے کہ تصوّف نے غزل کی بعض اصطلاحات کو اپنا کر اپنے رنگ میں رنگ دیا۔ جیسے ساقی ذات باری، ساغر۔ دل، شراب، محبت، مستی۔ عشق الٰہی میں سرشاری میخانہ خرابات۔ دائرہ عشق الٰہی۔ خراباتی۔ عاشق، شمع۔ نور حق، پروانہ، عاشق،

رندی۔ دنیوی علائق سے آزادی، ابرو۔ صفات جو ذات کا پردہ ہوتے ہیں۔ لب۔ خدا کی صنعت جو انسان کا وجود قائم رکھتی ہے، خال۔ راز وصل، زلف خدا کی ذات صفات کے پردے میں۔ رُخ۔ نورِ حق، خط۔ اظہار حقیقت، دیر۔ دنیا، اسی طرح فراق، فنا، صبا، شور، سخن، نرگسا، بت، آئینہ، عشرت کفر، کعبہ، وصل وغیرہ کو خاص معنوں میں استعمال کیا گیا ہے۔ تصوّف کے شامل ہونے سے صنف غزل کو بھی بہت فائدہ پہنچا۔ غزل کا دائرہ وسیع ہوگیا۔ تصوف فلسفہ، اخلاق کے مسائل کے آنے کی وجہ سے خیالات کا بیش بہا اضافہ ہوگیا۔ حسن و عشق کو وسیع معنوں میں استعمال کیا جانے لگا۔ تصوّف کے پرتو سے بعض عشقیہ مضامین کی قدریں بلند ہوگئیں۔ اور غزل کی زبان میں پاکیزگی بھی پیدا ہوگئی۔ غرض تصوف کا عنصر صنف غزل کے حق میں اتنا مفید ثابت ہوا کہ فارسی میں بقول مولانا شبلی "غزل کی ترقی تصوّف کی تاریخ سے شروع ہوئی۔" اس میں سرفہرست خواجہ حافظ ہیں جنہوں نے صوفیانہ اور فلسفیانہ خیالات کو غزل کی زبان میں اس خوبی سے ادا کیا کہ یہ دو آتشہ و سہ آتشہ بن گئی۔

اُردو شاعری کا تو آغاز ہی صوفیانہ شاعری سے ہوا۔ اردو زبان کی ادبی تشکیل ان مقدس ہستیوں کے مبارک ہاتھوں سے ہوئی جو دنیوی علائق سے دور نشہ عشقِ الٰہی سے مسرور ایک طرف اپنے محبوب حقیقی کی محبت کا دم بھرتے تھے اور دوسری طرف پیغام حق پہنچانا اپنا مقصد حیات تصور کرتے تھے۔ خدا نے شاعری انہیں ودیعت کی تھی۔ ان بزرگوں نے اپنے جذباتِ

عشق اور اپنے عقیدت مندوں کی رشد وہدایت کے لئے اردو ہی کو آلۂ کار بنایا۔ اس طرح اردو نے ادبی صورت اختیار کرلی۔

اردو کے ابتدائی دور یعنی نویں صدی ہجری سے گیارہویں صدی کے نصف اوّل تک گجرات و دکن میں چونکہ اردو نے صوفیا کی خانقاہوں میں پرورش پائی لہذا اس دور میں صوفیانہ مثنویاں پائی جاتی ہیں۔ اردو کو اپنے دوسرے دور میں جب تاجداران دکن کی سرپرستی حاصل ہوتی ہے تو صوفیانہ شاعری کے علاوہ غزل، قصیدہ، مرثیہ اور رومانی مثنوی سے بھی اس کا دامن بھر جاتا ہے اسی دور سے غزل میں بھی تصوف کی جھلکیاں نظر آنے لگتی ہیں۔ اور موجودہ دور تک غزل ہی کے پیمانے میں یہ شراب زیادہ تر چھلکتی پائی جاتی ہے۔

ولی سے پہلے سلطان قلی قطب شاہ نے عارفانہ وفلسفیانہ مضامین کو غزل میں ادا کرکے تغزل و تصوف کو ہم آہنگ کیا۔ قطب شاہ اگرچہ خانقاہ نشین صوفی نہ تھا لیکن اس کی طبیعت تصوف و فلسفہ کی طرف بہت زیادہ مائل تھی۔ وحدت الوجود کے مسئلہ کو اس نے اپنے کلام میں کئی جگہ مختلف طریقوں پر پیش کیا ہے۔ قطب شاہ کے بعد ولی آتا ہے۔ ولی کی مقبولیت کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ اس نے غزل کے پیمانے میں حقیقت کی شراب کو نہایت خوش اسلوبی سے پیش کیا ہے۔ اردو میں اس اعتبار سے ولی کا وہی درجہ ہے۔ جو بلبل شیراز کا فارسی شاعری میں ہے۔ تصوف ولی کی رگ وپے میں جاری وساری تھا اس کے جذبات اور کوچۂ عشق میں اس کے تجربے حقیقت پر مبنی ہیں لہذا اس کا تصوف رسمی و بے جان نہیں ہے۔ یہ ایک فنکار تھا اس نے اپنے جذبات و

قلبی واردات کی ادائیگی میں اس قدر جدت سے کام لیا ہے کہ غزل میں تازگی و شگفتگی پیدا ہوگئی۔ ولی نے تصوف کے عنصر کو چھپانے میں رمز و کنایہ سے ایسا کام لیا ہے کہ اس کے کلام میں مجاز پر بھی حقیقت کا دھوکہ ہوتا ہے۔ لیکن ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیئے کہ ولی مجتہد العصر استاد تھا۔ اس کے کلام کا ایک حصہ بے شبہ لسانی اجتہاد اور مجاز سے تعلق رکھتا ہے جس میں محبوب کی نسوانیت اپنی پوری بہار کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ اس کوچے کا ہر رہرو اپنے سفر کا آغاز مجاز سے کرتا ہے۔

کلام کا ایک حصہ تصوف کے نکات سے متعلق ہے جو شاعرانہ تو ہے لیکن متغزلانہ نہیں ہے لیکن بیشتر کلام رمز و کنایہ سے ذو معنین ہے۔ اسے جس عینک سے دیکھا جائے ویسا ہی نظر آتا ہے یہی وجہ ہے کہ ولی نے خواجہ حافظ سے ہمسری کا دعویٰ بھی کیا ہے۔

اب ہم ولی کے کلام کی طرف رجوع کرتے ہیں اور سب سے پہلے ایسے اشعار پیش کرتے ہیں جن میں ولی نے ایک رہبر کامل کی حیثیت سے طریق تصوف کی منزلوں اور مقاموں کی نشان دہی کی ہے۔

تصوف ایک قسم کی سیرت ہے شاہ ولی اللہ نے اسے مذہب اسلام کی باطنی حیثیت قرار دیا ہے۔ چونکہ اس تصوف کا تمام تر تعلق تصورات و احساسات اور نفس انسانی سے ہے اس لئے نفس کی تہذیب کی جاتی ہے جس کی وجہ سے انسان میں پاکیزگیٔ خیال و عمل، عجز و خضوع اور ایسے دوسرے نیک اخلاق پیدا ہو جاتے ہیں۔ کاروانِ تصوف کے سالاروں نے اس راہ کے

رہروؤں کو منزلِ مقصود تک پہنچانے کے لئے مختلف طریقے اور ضابطے اختیار کیے جن کی وجہ سے مختلف خانوادے وجود میں آگئے، لیکن اس راہ کی منزلیں مشترک ہیں جنہیں عام طور پر شریعت، طریقت، حقیقت و معرفت کہا جاتا ہے مذکورہ چار منزلوں میں سے ہر منزل پر کئی مرحلے درپیش ہوتے ہیں اور رہروؤں کو تربیت کے ایک خاص نظام سے گزرنا پڑتا ہے۔ ان کی تفصیلات بے شمار ہیں جو ہمارے موضوع سے خارج ہیں۔ اس لئے ہم یہاں چند خصوصیات یا نسبتوں کے پیش نظر ولی کے کلام کا مطالعہ کریں گے۔ تصوف کی نسبتوں میں سب سے اہم نسبت عشق ہے۔ ولی نے عشق کے متعلق اپنے کلام میں کئی جگہ اظہار خیال کیا ہے۔ اس سے پہلے چند مثالیں پیش کی جا چکی ہیں دو چار اور ملاحظہ فرمائیے :-

اے ولی غیر عشق حرفِ دگر
پختہ مغزاں کے نزد خامی ہے

عارفاں پر ہمیشہ روشن ہے
کہ فنِ عاشقی عجب فن ہے

در وادیٔ حقیقت جن نے قدم رکھا ہے
اوّل قدم ہے اس کا عشق مجاز کرنا

ان نے پایا ہے منزلِ مقصود
عشق جس کا ہے ہادی و رہبر

وادیٔ حقیقت کے رہرو کو عشق مجاز میں قدم رکھنے کی اس لئے تلقین

کرتا ہے کہ :-

حُسن تھا عالم تجرید میں سب سے آزاد
طالب عشق ہوا صورت انسان میں آ

اس وادی میں قدم رکھنے سے پہلے اپنے آپ کو اس طرح تیار کرتا ہے :-

مشق کر اے دل سدا تجرید کی
عاشقی ہے ابتدا توحید کی
ترک مت کر گفتگو تمہید کی
جن کو لذت ہے سجن کے دید کی
ان کو خوش وقتی ہے روز عید کی

راہِ سلوک کا رہرو بغیر راہنما تصوف کی دشوار گذار منزلیں طے نہیں کر سکتا۔ ولی کہتا ہے :-

ڈھونڈھتا ہوں عارف سالک ولی
اس بجز کوئی رہنما نہیں الغیاث

راہِ سلوک کی پہلی منزل شریعت ہے۔ اس منزل پر رہرو کے لئے یہ لازم ہوتا ہے کہ وہ اپنے عقائد درست کرے۔ اسلام کے ارکان کو بجا لائے وحدت الوجود اور تنزلات خمسہ کی بحثوں میں نہ پڑے۔ غرض اس منزل کی خصوصیت زہد و تقویٰ اور تسلیم و رضا ہے۔ ولی کہتا ہے :-

نعمت دین کے طلب میں مدام
دل مستی طالب خدا ہے حریص

مسند پہ عافیت کی وہ ہے بادشاہ وقت
جس دل کی انجمن میں ایماں ہے جیوں چراغ

سلوک کی دوسری منزل طریقت ہے۔ اس منزل پر دنیوی اغراض اور جاہ وجلال وغیرہ سے دل کو ہٹایا جاتا ہے اور بلند مقاصد کو پیش نظر رکھا جاتا ہے اس طرح دنیا کی برائیوں سے دل کو پاک کیا جاتا ہے اور اوراد و اذکار سے دل کی صفائی کی جاتی ہے یعنی ریاضت سے باطن کو اعلیٰ مقام کے لئے تیار کیا جاتا ہے توکل و قناعت بھی اس منزل کے اہم مقامات ہیں۔ ولی ان مقامات کے متعلق کہتا ہے :-

اے ولی ترک علائق دل کوں لذت بخش ہے
جیوں ہے دنیادار کوں فکر سر و سامان لذیذ
نشانی حق کے پانے کی جگت کی بے نیازی ہے
کشاکش کام اپنے کی جگت کی کارسازی ہے
ترک لذت کی جس کوں ہے لذت
شکر اس کوں ہے زہر، زہر شکر

چونکہ دل کشف و الہام کا آماجگاہ ہے اس لئے اسے کبر و غرور کے بوجھ سے ہلکا کرتا ہے :-

خودی سے اولاً خالی ہو اے دل
اگر اس شمع روشن کی لگن ہے
نکال خاطر فانوس جام جسم کا خیال
صفا کر آئینہ دل کا سکندری یہ ہے

ہوا نہیں جب تلک خالی اپس سوں
گرفتاراں میں ہرگز معتبر نہیں

دل کو اس دنیا سے ہٹانا بہت ہی دشوار کام ہے۔ اس دشواری کو ولی شاعرانہ انداز میں اس طرح پیش کرتا ہے :-

یاد کرنے کوں لیا ہاتھ میں من کا منکا
دل اُپر بوجھ پڑی من کا پھرانا مشکل

خدا کو یاد کرنے کے لئے ہاتھ میں دل کا دانۂ تسبیح لیا مگر دل پر یہ راز کھلا کہ اس دنیا سے دل کو ہٹانا مشکل ہے۔ لفظ منکا (دانۂ تسبیح) اور من (دل) سے شعر میں بڑا فائدہ اٹھایا ہے۔ اس منزل میں توکل قناعت اور استغنیٰ بڑے اہم مقامات ہیں۔ ولی کہتا ہے ؎

پایا ہوں ولی سلطنت ملک قناعت
اب تخت و چتر حق میں مرے ارض و سما ہے

سب کام اپس کے سونپ کے حق کوں نچنت رہ
یہ ہے تمام مقصد گفت و شنیدیاں

ولی کوں نہیں مال و زر کی آرزو
خدا دوست نیں دیکھتے زر طرف

اسباب سے جہاں کے ہوں ہے غرض سدا ہین
بن تیل اور بتی ہے روشن چراغ میرا!

منزل طریقت میں دنیا کے تعلقات کے جال سے آزادی حاصل کی جاتی ہے۔ کم آمیزی اور گوشہ نشینی اختیار کی جاتی ہے۔ ولی کہتا ہے ؎

آزاد کوں جہاں میں تعلق ہے جال محض
دل باندھنا کسو سوں ہے دل پر وبال محض
جن نے پکڑا گوشۂ آزادگی
اُس کوں موج بوریا شمشیر ہے

طریقت کی منزل پر جب تزکیۂ نفس اور قلب کے بعد آئینۂ دل میں جلا پیدا ہو جاتی ہے تو اس پر تجلیاں پڑنے لگتی ہیں۔ اور اسی منزل کو حقیقت کہتے ہیں۔ اس منزل پر بیداری بھی مشاہدہ ہوتا ہے۔ اس کے خاص مقام مراقبہ اور مجاہدہ ہیں۔ ولی کا کعبۂ دل عشق سے معمور ہے۔

اے ولی پرت سوں ہے معمور کعبۂ دل
نئیں باج حق کے دوجا دل کے حرم کا محرم

جب حسنِ ازل کی حقیقت کو پالیا تو پرتو حسن ازل سے آگے بڑھ گیا۔

اے ولی جب نظر میں وہ آیا!
نقش سب ماسوا کے ہو گئے رحل

حقیقت سے آگے معرفت کی منزل ہے اس جگہ قرب الٰہی نصیب ہوتا ہے جہاں حیرت و استعجاب کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ ولی اس منزل پر پہنچ کر کہتا ہے ؎ دیکھا ہے یک نگہ میں حقیقت کے ملک کوں
جب بے خودی کی راہ میں دل نے سفر کیا

ولی تصویر تیری جن نے دیکھی
مثال آرسی حیراں ہو لے ہے
اپنی مقصود دل کی نشان دہی کرتا ہے ؎
جو ولی ہے مرجع ہر جزو کل
وہ مرا مقصود جان و تن ہوا

اب کثرت میں وحدت کے جلوے نظر آتے ہیں یہی مسئلہ ہمہ اوست ہے۔ یہ مسئلہ تصوف کی جان ہے۔ ولی نے کئی طریقوں سے اس کو پیش کیا ہے۔

عیاں ہے ہر طرف عالم میں حسن بے حجاب اس کا
بغیر از دیدۂ حیراں نہیں جگ میں نقاب اس کا
ہر ذرۂ عالم میں ہے خورشید حقیقی
یوں بوجھ کے بلبل سوں ہر یک غنچہ دہاں کا
سبحن کے باغ عالم میں دگر نئیں
ہمیں میں ہے ولے ہم کو خبر نئیں

اس مسئلے کو ولی نہایت اچھی مثال کے ذریعہ اس طرح پیش کرتا ہے ؎

یک شمع گر در پیش و پس رکھے ہزار آرسی
دستا ہے نور ہر یک نئیں لیکن وہی یک شمع ہے

اوپر ہم نے ولی کے صوفیانہ خیالات کا جائزہ لے لیا اور یہ بھی دیکھ لیا کہ ولی نے حقائق و معارف کو شاعرانہ انداز میں کس طرح پیش کیا ہے اب ہم ولی

کے ایسے کلام کی طرف رجوع کرتے ہیں جس میں اس نے تصوف کو رنگِ تغزل میں پیش کیا ہے اس کے کلام میں بعض مقامات پر مجاز و حقیقت میں امتیاز کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ ان مقامات پر صرف ذوق اور گہری نظر ہی رہبری کر سکتے ہیں۔ ولی نے ایسے ہی کلام کے متعلق کہا ہے ؎

ولی تو بحرِ معنی کا ہے غواص
ہر اک مصرعہ ترا موتی کی لڑ ہے
اے ولی فکر صاف صاحب دل
گوہرِ بحرِ نکتہ دانی ہے
اے ولی مجھ سخن کو وہ بوجھے
جس کو حق نے دیا ہے فکر رسا
زاہد اگرچہ فہم میں ہے بوعلی وقت
میرے سخن کے رمز کو پایا نہیں ہنوز

ذیل کے اشعار ملاحظہ فرمائیے اور دیکھئے کہ یہ اپنے دعوے میں کہاں تک حق بجانب ہے :-

حسن و عشق اور محبوبِ حقیقی :-

حکمتِ عشق بوعلی سوں نہ پوچھ
نہیں قانون شناس اس فن کا
عجب نہیں دام میں اس کے اگر اٹکا ولی کا دل
کہ اس کے دام میں لاکھاں پھنسے ہیں اہل دیں آکر

یکتا ہوں بند دل کوں اس غیرت پری سوں
جن نے کیا ہے مجنوں عالم کوں دلبری سوں

عاشقاں کی قید تیرا حسن عالم گیر ہے
بُلبُلاں کوں بند کرنے موج گل زنجیر ہے

تجھ بھواں کے خم کوں دیکھا جب ستی اے قبلہ رو
رات دن رکھتا ہے زاہد مکھ اگے محراب کوں

اے ولی تعریف اس کی کیا کروں
ہر طرح مستغنی از اوصاف ہے

حُسن تیرا سورج پہ فاضل ہے
مُکھ ترا رشک ماہِ کامل ہے

جس کوں تجھ حسن کی نہیں ہے خبر
بے گماں وہ جہاں میں غافل ہے

معشوق ہے بغل میں ولی یہ سنتا ہوں میں
مت دل کے باج اس کوں کہیں جستجو کرو

دِل اور دل کی صفائی :-

دل کوں گر مرتبہ ہے درپن کا
مفت ہے دیکھنا سری جن کا

کیوں نہ صافی اس کوں حاصل ہووے مثل
اپنے جوہر کی حیا سوں سر بسر پانی ہوا

نہ جاوے کچھ چراغاں سوں شب فرقت کی تاریکی
اُجالا تب ہو مجھ گھر میں کہ جب وہ مہ جبیں آوے

غیر سوں خالی کیا ہوں دل کوں اپنے جیوں حباب
تجھ نگہ نے جب سوں بخشی خانہ بردوشی مجھے

دل سوں اپنے نکال وہم و خطر
راہ سیدھی ہے رہنما کی قدم

نقد دل دوجے کوں دینا تجھ بغیر
حق شناساں کے نزک اسراف ہے

دیدار و وصل :-

تجھ وصل کے خیال سوں غافل نہیں ولی
رہتا ہے رات دن وہ اسی کے سراغ میں

اب ولی سوں نہ ہو توں رو گرداں
تیرے کارن جو وہ خراب ہوا

اے ولی گل بدن کوں باغ میں دیکھ
دِل صد چاک باغ باغ ہوا

آرزو ہے نت ولی کوں وصل کی
کب ملے گا میرے تئیں وہ نور خاص

زاہد چلا ہے صورت محراب دیکھ کر
ابرو دکھا کے اسکوں پریشاں نکو کرو

کیا جیوں لفظ میں معنی ہسری جن
مقام اپنا دل و جان ولی میں
ایسا بسا ہے آکر تیرا خیال جیو میں
مشکل ہے جیو سوں تجھ کوں اب امتیاز کرناں

محویت و مستی :-

آرزوئے چشمۂ کوثر نہیں
تشنہ لب ہوں شربت دیدار کا
مست جام عشق کوں کچھ غم نہیں
خاطر ناصح اگر ناصاف ہے
کھویا ہے تجھ نگاہ نے عالم کے ہوش کوں
گردش عجب ہے تیری انکھیاں کے ایاغ میں
پڑی ہے آرسی حیرت میں تیرے مکھ کے جلوے سوں
مجھے تجھ حسن کی حیرت کی ہے سوگند اے ظالم
مستی نے تجھ نین کی بے خود کیا ولی کوں
آوے جو بزم مے میں کیوں ہوشیار جاوے
ساقی و مطرب آج ہیں ہمرنگ
نشہ بے خودی دو بالا ہے
ولی تصویر اس جن نے دیکھا
مثال آرسی حیراں ہوا ہے!

وحدۃ الوجود :-

خوشہ چین جمال جاناں ہیں
خرمن ماہ و خوشۂ پروین

ہوا ہے مجھ پہ شمع بزم یک رنگی سوں یو روشن
کہ ہر ذرّے اُپر تاباں ہے دائم آفتاب اس کا

ہوا ہے مست اہن کے جام لب سوں باغ میں لالہ
کہ جس کے مُکھ کے جلوے سوں کھلا گلزار ہر جانب

زلف و رُخ ہے ترا جو لیل و نہار
مجھ کوں واللیل والضحےٰ کی قسم

تجھ مکھ اُپر ہے رنگ شراب ایاغ گل
تیری زلف ہے حلقہ، دودِ چراغ گل

اس کے مکھ کی شعاع کوں کرتا ہے
ہر صُبح آفتاب استقبال

تیرے جلوے سوں ہے گل تازہ و تر
چمن ہیں بلبلاں کا ہر طرف جوش

کتابیات

تذکرۂ ریختہ گویاں	فتح علی حسینی گردیزی	ڈاکٹر عبدالحق ، انجمن ترقی اردو ہند، دہلی۔
گلشن گفتار	خواجہ خان حمید اورنگ آبادی	سید محمد
نکات الشعراء	میر تقی میر	سید محمد
تذکرۂ شعراء	میر حسن	ڈاکٹر عبدالحق
مخزن نکات	قیام الدین قائم	ڈاکٹر عبدالحق
مجموعۂ نغز	میر قدرت اللہ قاسم	محمود شیرانی
گلشن ہند	مرزا علی لطف	ڈاکٹر عبدالحق دارالاشاعت پنجاب،
چمنستان شعراء	لچھمی نرائن شفیق	ڈاکٹر عبدالحق. ، خاور علم پریس لاہور۔
سخن شعراء	عبدالغفور خان نساخ	مطبوعہ نول کشور
گلشن سخن	شیفتہ	
تذکرۂ ہندی	مصحفی	انجمن ترقی اردو، ہند، دہلی
تذکرۂ گلزار ابراہیمی	نواب ابراہیم خان	
مخزن شعراء	قاضی نورالدین حسین قاضی	ڈاکٹر عبدالحق
حدیقۂ احمدی مخطوطہ جلد	شیخ بہادر	مخطوطہ
آثار الشعرا	محمد ممتاز علی خاں	مطبع شاہجہانی، بھوپال
محبوب الزمن حصہ اوّل دوم	عبدالجبار خان ملکاپوری	رحمانی. حیدرآباد
ماثر الکرام (سرو آزاد)	غلام علی آزاد بلگرامی	رفاہ عام لاہور
آب حیات	محمد حسین آزاد	شیخ مبارک علی لاہور
شعر الہند	مولوی عبدالسلام ندوی	دارالمصنفین. اعظم گڈھ
گل رعنا	حکیم عبدالحئی	" "
اردوئے قدیم	حکیم شمس اللہ قادری	نول کشور
اردو شہ پارے	ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور	بکتبۂ ابراہیمیہ. حیدرآباد
دکن میں اردو	نصیر الدین ہاشمی	" " "
سخنوران گجرات مخطوطہ	سید ظہیر الدین مدنی	مخطوطہ
یورپ میں دکھنی مخطوطات	نصیر الدین ہاشمی	شمس المطابع. حیدرآباد
اردو کی ابتدائی نشوونما....	ڈاکٹر عبدالحق	انجمن ترقی اردو
مقالات شیرانی جلد اول دوم	مظہر محمود شیرانی	مجلس ترقی ادب۔ لاہور
مقالات ہاشمی	نصیر الدین ہاشمی	تاج کمپنی۔ لاہور
اردو مثنوی کا ارتقاء	عبدالقادر سروری	مکتبۂ ابراہیمیہ. حیدرآباد
شعر العجم جلد ۵	مولانا شبلی نعمانی	دارالمصنفین۔ اعظم گڈھ
دکھنی زبان کا آغاز و ارتقاء	ڈاکٹر شری رام شرما مترجم غلام رسول	اندھرا پردیش ساہتیہ اکیڈیمی. حیدرآباد

دکنی کا ابتدا	ڈاکٹر آمنہ خاتون	ہمدرد پریس۔ بنگلور
مرہٹی پر فارسی کا اثر	ڈاکٹر عبدالحق	انجمن ترقی اردو۔
گجراتی پر عربی فارسی کا اثر (گجراتی)	ڈاکٹر چھوٹو بھائی نائک (گجراتی)	گجرات ودیا سبھا۔ احمدآباد
نور العرفان مخطوطہ	شیخ محمد صالح سہروردی	مخطوطہ
فہرست ہندوستانی مخطوطات۔ انڈیا آفس	جیمس بلوم ہارٹ	
فہرست عربی مخطوطات۔ انڈیا آفس	آٹو لوتھ۔	
مراۃ احمدی۔ حصہ اوّل و خاتمہ	علی محمد خان بادشاہی دیوان	بڑودہ سریز۔ بڑودہ
اورنگ زیب جلد ۱۔ ۲۔ ۳۔ ۴	جادو ناتھ سرکار	
ہسٹری آف دہی مغل امپائر	ایشوری پرشاد	
ہسٹری آف گجرات جلد اول	ایم۔ ایس۔ کامی سریٹ	
یاد ایام	حکیم عبدالحئی	مطبع انسٹی ٹیوٹ کالج علیگڑھ سنہ ۱۹۱۹ء
رود کوثر	شیخ محمد اکرام	فیروز سنز۔ لاہور سنہ ۱۹۵۸ء
مقدمۂ رقعات عالمگیری	پروفیسر سید نجیب اشرف ندوی	دارالمصنفین۔ اعظم گڑھ
تاریخ گجرات	سید ابو ظفر ندوی	"
علیگڈھ تاریخ ادب اردو		علی گڑھ
تاریخ زبان اردو	ڈاکٹر مسعود حسین خان	سرسید بک ڈپو علی گڑھ ۱۹۵۸ء
اُردوے معلیٰ	خطوط غالب	
انسائیکلوپیڈیا آف اسلام		
دائرۂ معارف مضمون 'ولی'	ڈاکٹر عبدالحق	لاہور۔ پاکستان
خطبات گارسن دی تاسی	تاسی	
نذر ولی	طالبات جامعہ عثمانیہ	
الموسی (ولی نمبر) سنہ ۱۹۳۷ء	سٹی کالج میگزین حیدرآباد	سٹی کالج میگزین۔ حیدرآباد
ہندوستانی جولائی سنہ ۱۹۳۳ء		ہندوستانی اکیڈیمی الہ آباد
رسالہ مصنف ۱۲	علی گڈھ	علی گڑھ
اورنٹیل کالج میگزین لاہور	اگست ۳۴ء، نومبر ۳۷ء، فروری ۴۱ء	اورنٹیل کالج لاہور
رسالہ اردو سہ ماہی	جنوری ۴۷ء، جولائی ۵۶ء	انجمن ترقی اُردو
نوائے ادب	سنہ ۱۹۵۰ء سنہ ۱۹۵۱ء سنہ ۱۹۵۱ء	اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ بمبئی
برگ گل ۵۳-۱۹۵۳ء		کراچی۔ پاکستان
دیوان ولی	غلام محمد منظور سورتی سنہ ۱۲۹۰ھ	مطبع حیدری۔ بمبئی
کلیات ولی طبع اوّل	پروفیسر احسن مارہروی	انجمن ترقی اردو
کلیات ولی طبع دوم سوم	ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی	" "
مخطوطات و دستاویزات	مملوکۂ حسینی پروفیسر نجیب اشرف ندوی	

انجمن اسلام اُردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ

اور

ادبی پبلشرز

کی مطبوعات

			روپئے	پیسے
۱۔	ولی گجراتی طبع دوم	از ڈاکٹر سید ظہیر الدین مدنی	۱۰	
۲۔	نور المعرفت	از ولی گجراتی مرتبہ ڈاکٹر سید ظہیر الدین مدنی	۲	..
۳۔	اُردو مخطوطات مسجد جامع بمبئی	مرتبہ مولوی حامد اللہ ندوی	۴	..
۴۔	میرزا مظہر جان جاناں	از عبدالرزاق قریشی	۶	..
۵۔	لغات گجری	مرتبہ پروفیسر سید نجیب اشرف ندوی	۱۰	..
۶۔	دیوان عزلت	" عبدالرزاق قریشی	۱۰	..
۷۔	مبادیات تحقیق	از " " "	۴	۵۰
۸۔	نوائے آزادی	مرتبہ " " "	۵	..
۹۔	مقالہ نما (نوائے ادب)	مرتبہ مس رقیہ انعامدار	۲	..
۱۰۔	راگ مالا	از سید عبدالولی عزلت مرتبہ عبدالرزاق قریشی	۴	..
۱۱۔	نوائے ادب سہ ماہی	اڈیٹر۔ عبدالرزاق قریشی	سالانہ ۱۰	..

ملنے کا پتہ:

۱۔ ۲

ز ط ۱۹۰۵، نمبر ۸